# مجلس ادارت



## معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے　　فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

* سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY**
**AZAMGARH**

* رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔


جلد ۱۶۳　ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۹ء　عدد ۳


## فہرست مضامین

# شذرات

اس وقت پورے ملک میں الکشن کی ہل چل ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباروں میں اسی کا چرچا رہتا ہے، دار المصنفین ایک خالص علمی و تحقیقی ادارہ ہے، اس کو اور معارف کو اس قسم کے "رموز مملکت" اور انتخابی سیاست سے کوئی تعلق نہیں، اگر اس نے قوم کی ہنگامہ خیز سرگرمیوں اور عملی سیاست سے واسطہ رکھا ہوتا تو اس کے اصل مقاصد پس پشت ہو جاتے اور وہ گراں قدر علمی و ادبی خدمات انجام نہ پاتیں، جن سے ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کے تہذیبی سرمایے میں اضافہ ہوا اور جن سے حب وطن، آزادی اور قومی یک جہتی کو سہارا ملا۔ شخصی طور پر اس کے موسسین اور معماروں کو آزادی و اتحاد کی تحریک سے دلچسپی اور ہمدردی رہی اور انہوں نے فرقہ وارانہ رجحان کی مذمت کی۔ اس طرح قومی آزادی اور قومی یک جہتی کے جذبات دار المصنفین کے گوشہ نشین کارکنوں میں بھی سرایت کر گئے تھے، اس کے لٹریچر نے قوم و ملک کی ذہنی و دماغی تربیت کی اور درپیش حالات و مسائل میں ان کی رہنمائی کی۔ عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کے باوجود دار المصنفین نے حصول آزادی کی جد و جہد میں قومی تحریک کو قوت پہنچائی اور اس میں رخنہ انداز ہونے والے عناصر کی حوصلہ شکنی کی۔

---

آزادی ملتے ہی کانگریس میں فرقہ پرستوں کا غلبہ ہونے لگا جن کو مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا، حکومت، جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد کے راستے سے بھٹک گئی، آئین و قانون سے بے پروا ہو گئی، اقلیتوں کا مذہبی تشخص اور تہذیبی شناخت ختم کرنے لگی، اردو زبان کا گلا گھونٹنے لگی، نصابی کتابوں میں مخصوص مذہب اور کلچر کا پرچار اور مسلمانوں کی تاریخ و تمدن مسخ کر کے ان کی نئی نسلوں کے ارتداد کا سامان کیا جانے لگا، ملک میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا، رشوت اور چور بازاری ہونے لگی اور یہ مسند نشین لوگ خود بھی بہتی گنگا میں غوطہ لگانے لگے، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک نفرت، اشتعال، فرقہ وارانہ جنون، تشدد اور خوں ریزی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا لیکن گاندھی وادی اور اہنسا کے پجاری ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم بنے رہے، اس بدترین دور کا خاتمہ بابری مسجد کی شہادت پر ہوا۔

صبح تک تونے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا    یادگار شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

---



سمجھا جا رہا تھا کہ ان واقعات کا ضرر مسلمانوں ہی تک محدود رہے گا اور برق ان ہی پر گرے گی لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا، جمہوریت، سیکولرازم اور عدم تشدد کا تناور درخت مرجھانے لگا، ملک کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگیں، اس کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہونے لگا اور فرقہ پرستی کے عفریت نے خود کانگریس کو شکست و ریخت تک پہنچا دیا۔ معارف ملک کی چولیں ہلا دینے اور اسے تباہی کے دہانے تک پہنچا دینے والے ان واقعات کا خاموش تماشائی نہیں رہا، اس کی فکر مندی اور حب الوطنی نے مجبور کیا کہ وہ ملک کو بچائے، فرقہ وارانہ جنون کی مذمت کرے اور کانگریس کو متنبہ کرے کہ وہ سیکولرازم، جمہوریت اور عدم تشدد کے راستے سے منحرف ہو گئی ہے۔

---

فطرت کا عام قانون یہ ہے کہ وہ ظلم و جور کو بہت دنوں تک پنپنے نہیں دیتی اور فساد مچانے والوں کی جگہ دوسرے لے لیتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی یہی ہوا مگر پہلے لوگوں کی جگہ لینے والے لوگ بھی ان ہی غلطیوں کا اعادہ کرنے لگے جن کے مرتکب ہو کر ان کے پیش رو رسوا ہوئے تھے، مختلف پارٹیوں پر مشتمل جنتا پارٹی اور جنتا دل کی جو حکومتیں قائم ہوئیں اور جن کا قوم نے گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور جن کو مکمل تعاون بھی دیا مگر ان کی خود غرضی، استحصال، اختلاف، انتشار، اقتدار کی حرص و طمع اور ملک و وطن پر اپنی ذات، اپنے فرقے اور اپنے علاقے کی ترجیح انہیں لے ڈوبی اور قدرت کے دئے ہوئے موقع سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کی طرح انہیں بھی ان کی نااہلی اور عدم صلاحیت کی سزا ملی، پہلے تو شدید اختلافات کے باوجود اقتدار کی ہوس انہیں انتخابات کے موقع پر مجتمع کر دیتی تھی لیکن اس الکشن میں ان کے اختلاف کی گہری خلیج پٹ نہیں سکی، جب بے لوث خدمت اور بے غرض حب الوطنی کا جذبہ اور کوئی اعلیٰ اور بلند نصب العین نہ ہو اور صرف اپنی ذات، اپنے فرقہ و مذہب اور علاقے ہی کی بھلائی پیش نظر ہو تو اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

---

جنتا پارٹی اور جنتا دل نے کانگریس کا زور و اثر تو کم کر دیا مگر وہ خود مضبوط نہ ہو سکیں بلکہ ان کے سہارے بھارتیہ جنتا پارٹی کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور وہ ملک کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔ اس وقت سیاسی بے اصولی حد سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے بھارتیہ جنتا پارٹی کے خلاف محاذ بنانے والے بھی اس کی گود میں جا بیٹھے ہیں اور اصول پسندی کے دعوی کے باوجود وہ ان کا ہمنوا گت کر رہی ہے۔ کئی ریاستوں اور مرکز میں اس کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور اب اس کو اقتدار کا ایسا چسکا لگ گیا ہے کہ وزیر اعظم دوبارہ

برسر اقتدار آنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور یہ بھول گئے کہ وہ گزشتہ سال الکشن نہ لڑنے کا اعلان کرچکے تھے۔ بی۔ جے۔ پی کے متعلق ہم کو کچھ کہنا نہیں۔ وہ آر۔ ایس۔ ایس کا ایک بازو ہے، اس کے خطرناک عزائم اور منصوبوں کے بارے میں اخباروں میں برابر لکھا جاتا رہا ہے، ہندوستان کی بڑی بدنصیبی ہوگی اگر وہ برسر اقتدار آگئی۔ ہم کو حیرت ہے کہ جو سیکولر جماعتیں ابھی تک بی۔ جے۔ پی کے اثر سے محفوظ ہیں ان میں سے بعض کا طریقۂ عمل اس کو توانائی دے رہا ہے، سب سے زیادہ بدبختی اترپردیش کی ہے جہاں تین طاقت ور سیکولر پارٹیاں بی۔ جے۔ پی کو حریف بنانے سے زیادہ خود ایک دوسرے کی حریف ہوگئی ہیں، اس وقت تو مل کر تینوں کو اس فسطائی جماعت کا مقابلہ کرنا ضروری تھا، اسے زیر کرنے کے بعد ہی باہم زور آزمائی کرنی چاہئے تھی۔ کانگریس کا پچھلا ریکارڈ خراب اور بہت خراب ہے مگر اس سے اور بی۔ جے۔ پی سے برابر کی دوری رکھنا وقت کا اقتضا نہیں۔

---

ہم کو افسوس ہے کہ مسلمان اس وقت بھی جب کہ بی۔ جے۔ پی کے خطرات ان کے سروں پر منڈلا رہے ہیں، وہ اسے شکست دینے سے زیادہ سیکولر جماعتوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، گزشتہ دنوں اترپردیش کی ملی کونسل کی انتخابی یونٹ نے پارٹیوں کے مفاد سے بالاتر ہوکر بعض امیدواروں کے لئے سفارش کی تھی جو اپنے اپنے حلقوں میں بی۔ جے۔ پی کو شکست دے سکتے ہیں، اس کے اندازے میں غلطی ہوسکتی ہے مگر یہ جذبہ قابل قدر تھا، لیکن جن لوگوں نے کسی ایک پارٹی سے پیمانِ وفا باندھا ہے اور ان کو ملک و ملت سے زیادہ اس کا مفاد عزیز ہے ان کو یہ سفارش گراں گزری۔ ملک کی یہ بھی بدنصیبی ہے کہ بلا استثنا ہر پارٹی جرائم پیشہ افراد اور فلمی ہیروؤں کو اپنا امیدوار بنا رہی ہے، مسلمانوں کو صاف ستھرے، بے داغ اور سیکولر امیدواروں کا ساتھ دینا چاہئے، اصل مسئلہ اس وقت بی۔ جے۔ پی کی پیش رفت کو روکنا ہے، اس لئے ایسے ہی امیدواروں کی حمایت کرنی چاہئے جو اس کو شکست دینے کی پوزیشن میں ہوں، یہ بھی بدقسمتی ہے کہ مسلمان ووٹر لسٹوں میں اپنا صحیح نام درج کرانے سے بے پروا رہتے ہیں اور اپنے ووٹوں کی تقسیم کے معاملے میں بھی چوکنا نہیں رہتے، اس لئے انتخابی نتائج سامنے آتے ہیں تو اپنا سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔

---



## مقالات

# تجرباتی علوم کی حقیقت واہمیت

از جناب مولانا محمد شہاب الدین ندوی*

(۲)

### اسباب وعلل اسلام کی نظر میں

اسلام کو اس قسم کے تجرباتی علوم و مسائل سے انکار نہیں ہے جو اسباب وعلل کے تابع ہوں۔ اسباب وعلل کے ذریعہ نظام فطرت کے جو مجربات (آزمودہ چیزیں) یا نتائج فکریہ (استقرائی حقائق) سامنے آتے ہیں وہ دین میں حجت ہیں اور ان کے ذریعہ دلیل واستدلال کے میدان میں بھی کام لیا جاتا ہے، کیونکہ ان کی بنیاد استقرار پر ہے اور یہی حقائق و معارف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عظیم میں انسان کو نظامِ فطرت میں غور وخوض کرنے کی جو دعوت دی گئی ہے وہ استقرائی اعتبار سے اسباب وعلل کا کھوج لگا کر ایک مسبب الاسباب ہستی کے وجود کا پتہ لگانے کی دعوت ہے جو پردے کے پیچھے بیٹھ کر ڈور ہلا رہا ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یونانی فلاسفہ اور ان کی اتباع کرنے والے بعض مسلم فلسفی بھی تجربات و مشاہدات اور ان کے منطقی نتائج کو تسلیم نہیں کرتے تھے جن کا رد قرآن حکیم میں موجود ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی بعض آیات اگلے صفحات میں پیش کی جارہی ہیں۔

غرض اہل کلام میں جہم اور ابوالحسن اشعری کو چھوڑ کر باقی تمام جمہور اہل اسلام کے نزدیک

---

* ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ۔ بنگلور۔

اسباب وعلل شرعی نقطۂ نظر سے قابل حجت ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے تجرباتی امور اور اسباب وعلل پر بحث کرتے ہوئے صراحت کی ہے کہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک ان کا حجت ہونا ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ کیونکہ اس سے قیاس واجتہاد میں بھی خوب کام لیا جاتا ہے اور طبی امور میں بھی اسباب وعلل کا کافی دخل ہے:

واما جمهور العقلاء من المسلمين وغير المسلمين، اهل السنة من اهل الكلام والفقه والحديث والتصوف، وغير اهل السنة من المعتزلة وغيرهم، فيثبتون "الاسباب" ويقولون: كما يعلم اقتران احدهما بالآخر فيعلم ان في النار قوة تقتضي التسخين وفي الماء قوة تقتضي التبريد وكذلك في العين قوة تقتضي الابصار، وفي اللسان قوة تقتضي الذوق ويثبتون "الطبيعة" التي تسمى الغريزة[1]

جمہور مسلم وغیر مسلم اہل عقل وخرد جن میں اہل سنت کے متکلمین، فقہا، محدثین اور صوفیہ کے علاوہ غیر اہل سنت میں معتزلہ وغیرہ بھی شامل ہیں، سب کے سب "اسباب" کا ثابت ہونا تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسباب وعلل کے لزوم سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ میں گرمانے کی قوت پائی جاتی ہے، پانی میں ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، آنکھ میں دیکھنے کی قوت اور زبان میں ذائقے کی قوت موجود ہے اور وہ اس سے طبیعت کا اثبات کرتے ہیں جسے غریزہ (جبلت) کہتے ہیں۔

## تجرباتی علوم ابن تیمیہ کی نظر میں

علامہ موصوف عقل وتجربے کے ذریعہ ثابت شدہ حقائق کو معتبر قرار دیتے ہوئے اس سلسلے میں مزید تحریر کرتے ہیں:



فالمقصود ان لفظ "التجربة" يستعمل فيما جربه الانسان "بعقله وحسه" وان لم يكن في مقدوره انه كم قد جربوا انه اذا طلعت الشمس انتشر الضوء في الآفاق، واذا غابت اظلم الليل وجربوا انه اذا بعدت الشمس عن سمت رؤوسهم جاء البرد واذا جاء البرد سقط ورق الاشجار وبرد ظاهر الارض وسخن باطنها واذا قربت من سمت رؤوسهم جاء الحر واذا جاء الحر اورقت الاشجار وازهرت فهذا امر يشترك في العلم به جميع الناس لما قد اعتادوه وجربوه[2]

پس اس سے مقصود یہ کہ لفظ "تجربہ" ایسے امور کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کا انسان نے اپنی "عقل اور حس" کے ذریعہ تجربہ کیا ہو، اگرچہ وہ اس کی دسترس میں نہ ہو۔ چنانچہ لوگوں کا تجربہ ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ جب وہ غائب ہوتا ہے تو رات کی تاریکی چھا جاتی ہے، اسی طرح لوگوں کا تجربہ ہے کہ سورج جب ہمارے سروں کی سمت میں ہم سے دور ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے موسم سرما آتا ہے۔ جب سردی آتی ہے تو درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں، اس کی اوپری سطح ٹھنڈی ہو جاتی ہے جب کہ اس کا اندرونی حصہ گرم رہتا ہے۔ اسی طرح سورج جب ہمارے سروں کی سمت میں قریب ہو جائے تو موسم گرما آتا ہے اور جب گرمی آتی ہے تو درختوں میں

پتے اور پھول نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا علم ہے جس میں تمام لوگوں کے (مشاہدات) مشترک ہیں۔ کیونکہ وہ ان امور کے عادی ہیں اور ان کا تجربہ کر چکے ہیں۔

اس سلسلے میں موصوف نے مزید وضاحت کی ہے کہ حواس خمسہ میں "سمع و بصر" یعنی سماعت و بصارت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ دونوں علم کا اصل سرچشمہ ہیں اور انہی دو خصوصیات کی بنا پر انسان بہائم سے ممتاز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سمع و بصر اور "فواد" (عقل) کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے [3]

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل: ۳۶)

کان، آنکھ اور فواد سب سے یقیناً باز پرس کی جائے گی۔

واضح رہے اس موقع پر علامہ موصوف نے تجربے و مشاہدے کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عمومی ہیں، جن کو ہر عام و خاص اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، مگر موجودہ دور میں جدید سائنس نے دوربین اور خوردبین کے ذریعہ جن حقایق کا پتہ چلایا ہے اور خاص کر لیبورٹریوں میں مسلسل تجربات کے ذریعہ مادہ اور انرجی کے اندرونی اسرار اور ان کے حیرت انگیز تعامل کے بارے میں جو اکتشافات کئے ہیں ان کو صرف خواص ہی سمجھ سکتے ہیں جن کو اس علم سے خصوصی لگاؤ ہے اور یہ حقایق و اسرار عوام کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگ ان پر یقین نہیں کرتے۔ مگر یہ سب علمی دنیا کے حقایق ہیں جن کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں علامہ ابن تیمیہؒ نے رویت و مشاہدہ کا انکار کرنے والوں کے رد میں بطور حجت "مشہور چیزوں" کی ایک مثال اس طرح پیش کی ہے:



ومن "المحسوسات" المعروفة بالرؤية من الحيوان والنبات وغير ذلك يوجد ببعض البلاد دون بعض فيكون "مشهورة" و "مرئية" لمن رآها دون سائر الناس فانهم انما يعلمون ذلك "بالخبر" وذلك الخبر قد يكون المشتركون فيه اكثر من المشتركين في "الرؤية" [4]

"معروف محسوسات" میں حیوانات و نباتات وغیرہ کی بہت سی انواع بھی شامل ہیں جو بعض ملکوں میں تو پائی جاتی ہیں اور بعض میں نہیں۔ مگر وہ ان لوگوں کے لئے بہت "مشہور" اور "دیکھی ہوئی" ہیں جنھوں نے ان کا مشاہدہ کیا ہے، بہ نسبت دوسروں کے جنھوں نے صرف "خبر" کے ذریعہ ان کو جانا ہے اور اس خبر کا حال معلوم کرنے والوں کی اکثریت ہوتی ہے، بہ نسبت دیکھنے والوں کے۔

موصوف نے ایک اور موقع پر صراحت کی ہے کہ:

فالذى يعلم بالحس والعقل الصريح لا يخالفه شرع، ولا عقل ولا حس فان الادلة الصادقة لا تتعارض مدلولاتها، ولكن ما يقال بقياس فاسد وظن فاسد يقع فيه الاختلاف۔ [5]

جو چیز حس اور عقل صریح سے معلوم ہو شریعت اس کی مخالف نہیں ہے اور نہ عقل و حس ہی اس کی مخالف ہے۔ کیونکہ صحیح دلائل باہم متعارض نہیں ہوتے۔ ہاں البتہ جو بات قیاس فاسد اور ظن فاسد کے طور پر کہی گئی ہو اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

موصوف ایک اور موقع پر تحریر کرتے ہیں کہ طبیعی امور اور ریاضی کے معلوم حقایق کا انکار دین سے دوری کا سبب بن سکتا ہے۔ لہذا شرعی وعقلی مسائل میں بلا علم گفتگو کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے نہ تو دین کی نصرت ہوتی ہے اور نہ معترضین کا منہ ہی بند ہو سکتا ہے [لہ]

ایک اور جگہ تصریح کرتے ہیں کہ دین کے (حقایق) اور عقل صحیح ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ بل کل ما یعلم بالعقل الصریح فلا یوجد عن الرسول الا ما یوافقه ویصدقه [ئه]

**قیاس واجتہاد اور تجرباتی حقایق** غرض تجربات ومشاہدات اور محسوسات کا کسی بھی حال میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ بدیہی چیزوں کا انکار ہوگا۔ یہ پوری کائنات اسباب و علل ہی کی بنیاد پر قائم ہے اور انسان کو دن رات اس قسم کے تجربات ومشاہدات سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور وہ اپنے تجربات کی بنا پر اشیاء میں موجود نفع ونقصان کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان میں موجود منافع سے مستفید ہوتا اور ان کے نقصانات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ آگ جلاتی ہے لہذا وہ اپنا ہاتھ آگ میں ڈالنے کی حماقت کبھی نہیں کرے گا۔ اسے معلوم ہے کہ زہر کھانے سے موت واقع ہو جاتی ہے لہذا وہ زہر منھ میں کبھی نہیں ڈالے گا۔ اسے علم ہے کہ سانپ کے ڈسنے سے پورا جسم مسموم ہو جاتا ہے لہذا وہ سانپ سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ اسے معلوم ہے کہ چاقو لگنے سے جسم سے خون بہنے لگتا ہے لہذا وہ چاقو اپنے جسم میں کبھی نہ چبھوئے گا۔ وقس علی ذلک۔

یہ فطرت کے وہ "قوانین" ہیں جن کو ایک عالم اور عامی سبھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ تو ظاہری قوانین ہیں، جب کہ بہت سے "پوشیدہ قوانین" وہ ہیں جن کو سائنس داں مادی اشیاء کی چھان بین اور گہرے مطالعے کے بعد دریافت کرتے ہیں۔ انہی کو "قوانین فطرت" کہا جاتا ہے اور قوانین فطرت وہ "مسلمات" ہیں جو دنیائے سائنس میں متفقہ طور پر تسلیم شدہ ہیں جن کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ وہ صدہا سال کے مسلسل تجربات کا نتیجہ ہیں۔ اس بنا پر وہ لوگوں کے لئے قابل تسلیم ہیں۔ نیز اسی طرح طبی علوم کی بنیاد بھی اسباب و علل یا قوانین فطرت ہی پر ہے۔



اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ خود اصول فقہ کی رُو سے بھی اس قسم کے تجرباتی حقایق قابل حجت ہیں۔ چنانچہ قیاس واجتہاد کا مدار "علت" پر ہے اور علت میں تجرباتی امور اور اسباب و علل کا کافی دخل ہے۔ ایک چیز کو دوسری چیز پر قیاس کرنا اس "مشترک علت" کی بنا پر ہے جو دونوں میں پائی جاتی ہو۔ چنانچہ اسلام میں شراب حرام ہے اور شراب میں حرمت کی وجہ اس کی "نشہ آوری" ہے۔ لہذا فقہا نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جس میں یہ علت پائی جاتی ہو۔ اسی علت کی بنا پر ہم موجودہ دور میں بھنگ، چرس، افیم، براؤن شوگر اور ہیروئن اور مختلف قسم کی شرابوں جیسے بیئر، وہسکی، رم اور شیمپین وغیرہ نئے نئے ناموں کے ذریعہ منظر عام پر آنے والی مسکرات (نشہ آور چیزوں) کو بھی حرام قرار دے سکتے ہیں۔

دیکھئے اگر تجربات ومشاہدات کو قابل حجت نہ مانا جائے تو پھر قیاس واجتہاد کی عمارت سرے سے منہدم ہو جائے گی اور کسی پر بھی حجت قائم نہ ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات حکمتِ الٰہی کی نفی کرنے کے برابر ہے۔ غرض تجرباتی علوم کا انکار حقایق وواقعات کا انکار ہے جو غیر معقول ہے۔

**تجرباتی علوم اور دلائل ربوبیت** اگر ہم تجرباتی امور وحقایق کو حجت نہ مانیں تو پھر قرآنی نقطۂ نظر سے "دلائل ربوبیت" بھی ثابت نہیں ہو سکتے جو بطور "آیات" نقاش فطرت نے نظامِ فطرت میں عبرت وبصیرت کی غرض سے رکھ چھوڑے ہیں۔ اس طرح باغی انسانوں پر دلیل واستدلال اور حجت وبرہان کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ کہ قرآن عظیم کی وہ سینکڑوں آیتیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں جو اس صحیفۂ حکمت میں منکرینِ حق کی ہدایت

یا ان پر اتمام حجت کے طور پر مذکور ہیں۔ حالانکہ قرآن عظیم اپنی دلالت میں قطعی اور محکم ہے جو کبھی اور کسی حال میں معمہ یا چیستان نہیں ہو سکتا۔

إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (طارق: ۱۳-۱۴)

یہ قرآن یقیناً ایک فیصلہ کن کلام ہے، نہ کہ ہنسی مذاق کی بات۔

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ (نمل: ۶)

یہ قرآن آپ کو ایک دانش مند اور ہمہ دان ہستی کی طرف سے عطا کیا جا رہا ہے۔

لہٰذا اس خدائی فرمان کے مقابلے میں کسی بھی شخص کی بات پر کان دھرا نہیں جا سکتا خواہ وہ کتنا ہی بڑا "عالم" کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید ہی ہمارے لئے آخری دلیل اور آخری سند ہے اور ہم اسی کی بات پر کان دھرنے کے پابند ہیں۔

## تجرباتی علم کی حجیت پر قرآن کا فتویٰ

چنانچہ اس موقع پر بعض قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مشاہداتی و تجرباتی علم قرآن کی نظر میں معتبر ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی تحقیقات حقیقت حال تک پہنچ سکتی ہیں۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (انبیاء: ۳۰)

کیا ان منکرین حق نے مشاہدہ نہیں کیا کہ زمین و آسمان (ابتدا میں) باہم ملے ہوئے تھے جن کو ہم نے جدا کر دیا اور پانی ہی سے ہر زندہ چیز بنائی؟ تو کیا وہ (ہماری ربوبیت) پر ایمان نہیں لائیں گے؟

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ

کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا



فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (نحل: ۷۹)

کہ وہ آسمان کی فضا میں کس طرح تھامے گئے ہیں؟ انہیں سوائے اللہ کے اور کوئی تھام نہیں سکتا۔ ایمان لانے والوں کے لئے اس باب میں بڑی نشانیاں موجود ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔ (ذاریات: ۲۰-۲۱)

یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہاری ہستیوں (جسمانی نظاموں) میں بھی، کیا تم کو نظر نہیں آتا؟

اور یہ مذکورہ تمام آیات انسانی رویت و مشاہدہ کے حجت ہونے پر دلیل ناطق ہیں اور یہ آیات بطور مثال پیش کی جا رہی ہیں، ورنہ پورا قرآن اس قسم کی آیات سے بھرا ہوا ہے اور ان کا انکار قرآن کی تکذیب کے برابر ہے۔ نعوذ باللہ۔

بہر حال اس موقع پر ان آیات کی مختصر تشریح و تفسیر کی جاتی ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیاء کی آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان کا صرف مشاہدہ ہی نہیں بلکہ اس کے علمی قیاسات بھی قابل حجت و استدلال ہیں۔ کیونکہ خالق ارض و سما اس موقع پر منکرین کو ماضی بعید کے ایک "کائناتی واقعے" کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرما رہا ہے کہ کیا انہوں نے اس واقعے کا مشاہدہ نہیں کیا؟ اس سے موجودہ سائنسی نظریہ "بگ بینگ تھیوری" کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نظریہ (نظریۂ عظیم دھماکہ) کے مطابق سائنسی دنیا میں غالب قیاس یہ ہے کہ ہماری پوری کائنات ابتدا میں ایک عظیم گولے کی شکل میں تھی، جس میں ایک بڑا دھماکہ ہوا جس کے باعث

اس کا مادہ منتشر ہوکر لاتعداد کہکشاؤں، ستاروں اور سیاروں کی شکل اختیار کر گیا اور یہ سائنس دانوں کا مقبول ترین نظریہ ہے، جو ۱۹۲۷ء سے آج تک قائم ہے[۸]۔

اور اس آیت میں جو دوسری بات بیان کی گئی ہے وہ "تمام جانداروں کے پانی سے مرکب ہونے" کی حقیقت ہے۔ چنانچہ جدید سائنس نے لیبورٹریوں میں مسلسل تجربات کے بعد اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے کہ تمام زندہ اشیاء یعنی حیوانات و نباتات کے جسموں کے اندر پایا جانے والا بنیادی مادہ (پروٹوپلازم) کا تقریباً ۹۰ فی صد حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے[۹]۔

اس اعتبار سے یہاں پر ایک سماواتی واقعہ انسان کے علمی قیاس پر دلالت کر رہا ہے تو دوسری طرف ایک تجرباتی حقیقت کے ذریعہ جانداروں کے اجسام اور ان کی بناوٹ میں پانی کا عنصر غالب طور پر پائے جانے کی کیفیت بیان کی جا رہی ہے۔ پہلی حقیقت ماضی بعید سے متعلق ہے جب کہ دوسری حقیقت انسان کے سامنے کی چیز ہے۔ لہٰذا ان دونوں اعتبارات سے انسانی قیاس اور اس کا مشاہدہ و تجربہ قرآن کی نظر میں قابل حجت ہے اور پھر اس موقع پر یہ جو کہا گیا ہے کہ کیا وہ ان اسرار سربستہ کے انکشاف ربانی کے مشاہدے کے بعد بھی اس ہمہ دان ہستی کی ذات و صفات پر ایمان نہیں لائیں گے؟ ظاہر ہے کہ چودہ سو سال پہلے ان کائناتی حقایق اور نظام فطرت کے رازوں سے کوئی انسان واقف نہیں تھا۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ یہ کلام برحق اس ہستی کی جانب سے نازل کردہ ہے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے اور اس اعتبار سے اس کائنات میں ایک ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو انسان نہیں بلکہ ایک مافوق الفطرت ہستی ہے، یہی خدا ہے، جو اس کائنات میں اپنی ہمہ دانی کے کرشمے دکھا رہا ہے۔ ان حقایق کے ملاحظہ سے ثابت ہوگیا کہ ہماری کائنات کے پرے ایک دوسری کائنات بھی ضرور موجود ہے۔ جس کے تکوینی و تشریعی احکام اس جہان آب و گل پر نافذ ہو رہے ہیں۔ اس بحث سے طبیعیات اور مابعد الطبیعیات میں ربط و تعلق پر



بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

**علم الٰہی اور قدرت الٰہی کا نظارہ** اب جہاں تک سورۂ نحل والی آیت کا تعلق ہے تو اس میں پرندوں کی حیرت انگیز خلقت اور ان کے آسمانی فضا میں معلق ہو کر اپنے پر پھیلائے ہوئے تھمے رہنا ربوبیت کی ایک واضح دلیل ہے۔ چنانچہ رب العالمین نے ان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ وہ اپنے وزنی اجسام کے باوجود نیچے گر نہیں پڑتے اور ہوا کے رقیق ہونے کے باوجود فضا میں پر پھیلائے ہوئے اس طرح ٹھہرے رہتے ہیں گویا کہ انہیں کوئی سہارا دے رہا ہو اور یہ سہارا دینے والا سوائے خلاق عالم کے اور کوئی نہیں ہے۔ یہ بھی ایک دلیل ہے کہ اس کائنات میں ایک زبردست قوت و قدرت والی ہستی ضرور موجود ہے جس کے کرشمے عجیب و غریب اور انسانی عقل کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کرنے والے ہیں۔

غرض سورۂ انبیا والی آیت میں "علم الٰہی" کی ازلیت پر روشنی ڈالی گئی تھی جب کہ زیر بحث آیت میں اس کی بے مثال "قدرت" اور اس کی قوت تخلیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ علم اور قدرت کے اس مشاہدے سے انسان کو دعوت ایمان دی جا رہی ہے کہ وہ ایک "علام الغیوب" اور "قادر مطلق" ہستی کے وجود پر ایمان لائے اور اس کی یہ حقیقت و عظمت موجودہ سائنسی دور میں اور سائنسی تحقیقات ہی کی روشنی میں جلوہ افروز ہو رہی ہے اور اس اعتبار سے وجود خداوندی کوئی داستان پارینہ یا کسی "تاریک دور" کی نشانی نہیں بلکہ ایک علمی و سائنسی حقیقت ہے جو علم اور سائنس کی پوری روشنی میں منظر عام پر آ رہی ہے۔

ان دونوں آیتوں میں انسان کو دعوت ایمان دی گئی ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں فرمایا گیا "اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ" اور دوسری آیت میں ارشاد ہوا "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ"۔ معلوم ہوا کہ اس کائنات میں ایسے بہت سے حقایق ہیں جو انسان کو ایک لمحۂ فکریہ عطا

کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ ذاریات والی آیات اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ چنانچہ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روئے زمین پر ایسی بہت سی نشانیاں (دلائل ربوبیت) بکھیر دیے گئے ہیں جو یقین آور ہیں یعنی ان سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور "أَفَلَا تُبْصِرُونَ" سے یہ بے غبار حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ انسان ان آیات و نشانات کو اپنی آنکھوں سے (یعنی علم قطعی کے طور پر یا بصیرت افروز طور پر) دیکھ سکتا ہے۔

غرض یہ آیات کریمہ انسانی علم یا اس کے مشاہدات و تجربات کے قابل حجت ہونے کا فتویٰ صادر کر رہی ہیں۔ کیا ان قطعی دلائل کے ملاحظے کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ علم انسانی اور اس کے تجربات ناقابل استدلال ہیں۔

| | |
|---|---|
| تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ | یہ اللہ کی آیات ہیں، جنھیں ہم آپ کو |
| بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ | حقانیت کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے ہیں |
| وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ۔ | لہٰذا یہ لوگ اللہ اور اس کی آیات کے |
| (جاثیہ: ۶) | بعد پھر کس بات پر ایمان لائیں گے؟ |

## جدید علم کلام کی ضرورت

اس بحث سے یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آگئی کہ انسانی مشاہدات و تجربات قابل اعتبار اور قابل استدلال ہیں جو اسباب و علل کے تابع ہیں۔ چنانچہ ان کے ذریعہ قوانین فطرت یا قوانین ربوبیت کی تنقیح ہوتی ہے اور قوانین فطرت کے اثبات سے "آیات اللہ" یا دلائل ربوبیت کی حقیقت واضح ہوتی ہے اور پھر دلائل ربوبیت کے ذریعہ "علم الٰہی" اور "قدرت الٰہی" کی حقیقت و ماہیت پر روشنی پڑتی ہے جو ربوبیت کے دو بازو یا اس کے دو نمایاں مظہر ہیں اور ان دو مظاہر کے ذریعہ خدا کا وجود، اس کی وحدانیت، اس کی خلاقیت اور اس کی ازلیت و ابدیت پر علمی و سائنسی نقطۂ نظر سے بھرپور روشنی پڑتی ہے اور یہ تمام حقائق



دن کے اجالے میں دو اور دو چار کی طرح ثابت ہوتے ہیں اور ان حقائق کے ذریعہ مادیت و لادینیت کا رد بھی موثر طور پر ہو سکتا ہے۔ قرآن اور سائنس کی اس تطبیق سے یہ حقیقت بھی پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ علم صرف وہی نہیں جو تجربات و مشاہدات سے حاصل ہوتا ہو جیسا کہ مادہ پرستوں کا ادعا ہے بلکہ علم وہ بھی ہے جو وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر علم انسانی یا تجرباتی علم نے اپنے ہی تجربات و مشاہدات کے ذریعہ علم الٰہی (یا وحی والہام) کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ کلامی یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ ایک عظیم انقلاب ہے جو احیائے دین اور احیائے علم کی راہ میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب دینی و اخلاقی اقدار کو دقیانوسیت کی نشانی یا کسی مجذوب کی بڑ سمجھ کر دھتکار دیا جاتا تھا۔ اب خود علم و تحقیق کی روشنی میں ایسے نئے نئے آفاقی دلائل و براہین سامنے آرہے ہیں جن کی تجلیوں سے مادہ پرستوں کی آنکھیں چکاچوند ہو سکتی ہیں اور مادیت کے ایوانوں میں زلزلہ آسکتا ہے۔ اس اعتبار سے آج جدید سائنس اور اس کی تحقیقات و اکتشافات اسلامی عقائد اور اس کے ابدی حقائق کی تصدیق و تائید کیا کر رہے ہیں گویا کہ مادیت کی قبر کھود رہے ہیں، یا مادہ پرست اپنی قبر آپ کھود رہے ہیں اور اس اعتبار سے اب مادہ پرستی نزع کے عالم میں ہے۔ بس اب اسے ایک دھکا دینے کی ضرورت ہے، پھر اس کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے آگرے گی۔

حاصل کلام یہ کہ قرآن عظیم کے ابدی اور آفاقی حقائق سائنسی تحقیقات کی روشنی میں اجاگر کر کے عالم انسانی کی صحیح رہنمائی کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اس علم کو ہم "جدید علم کلام" یا "قرآنی علم کلام" بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ کام امت کے پختہ کار علماء کے کرنے کا ہے، جو قرآنی علوم اور سائنسی علوم میں یکساں درک رکھتے ہوں۔ چونکہ کوئی ایک شخص ان تمام

علوم پر دسترس حاصل نہیں کر سکتا اس لئے اس کام کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہے، جو مختلف علوم و مسائل پر حاوی ہو اور جب تک یہ کام مکمل نہ ہو عصر جدید پر حجت پوری نہیں ہو سکتی اور مادیت کا زور ٹوٹ نہیں سکتا۔ لہذا یہ کام پوری امت کے ذمہ ایک فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ کا یہ مطلب ہے کہ اگر تمام لوگ اس سے غافل ہو جائیں تو سب کے سب گنہگار ہو جائیں گے۔

**قرآن اور سائنس میں تطبیق کے بعض اصول**

اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدید علم کلام کی تحقیق و تدوین کے لئے چند ایسے اصول و کلیات بیان کر دیے جائیں جو قرآن او سائنس میں تطبیق دینے کے سلسلے میں رہنما اصولوں کا کام دے سکیں۔ ان کے علاوہ راقم السطور نے اپنی تصانیف میں جابجا اس موضوع پر خاصا مواد جمع کر دیا ہے اور خاص اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب بھی زیر تصنیف ہے۔

۱۔ جب کوئی جدید علمی حقیقت یا سائنسی اکتشاف بغیر کسی تاویل کے قرآن کے منصوص بیان سے ہم آہنگ ہو جائے تو کہا جائے گا کہ تحقیقات جدیدہ نے قرآنی بیان کی تصدیق و تائید کی ہے۔

۲۔ قرآنی حقایق اور اکتشافات جدیدہ کی ہم آہنگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن سائنسی نظریات کی تصدیق کر رہا ہے، جس کی وجہ سے مادہ پرستی کو بڑھاوا مل سکتا ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا دعا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک الٹا رخ ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے قرآن عظیم نے جو دعوے کئے تھے اور جن اسرار سربستہ کی نشان دہی کی تھی اس کی تصدیق اب خود "مادہ پرستانہ" سائنس کرتے ہوئے خدا پرستی کا اثبات کر رہی ہے۔

۳۔ قرآنی حقایق اور اس کے دعوؤں پر جدید سائنس کی یہ تصدیق و تائید فلسفیانہ اور مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے ایک علمی شہادت کا درجہ رکھتی ہے جو نہایت درجہ اہم ہے۔ چنانچہ اس شہادت کی بنا پر ہم کلامی نقطۂ نظر سے بہت سے نتائج نکال سکتے ہیں، جن سے الحاد و مادیت



کی تردید اور قرآنی نظریۂ علم کا اثبات نیز "اصول دین" کی تائید ہوتی ہے۔

۴۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلی جو حقیقت ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سائنس اور قرآن کی اس تطبیق سے مادیت کی یہ بنیاد ڈھ جاتی ہے کہ یہ کائنات بخت و اتفاق کے طور پر وجود میں آئی ہے اور محکم طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ضرور ہے جس نے اپنی تخلیقات کے "بھید" اپنی کتاب حکمت میں ایک منصوبے کے تحت پہلے ہی سے درج کر دئے ہیں تاکہ جدید سے جدید تر اکتشافات کے باعث اس کے "علم ازلی" کی تصدیق ہو سکے۔

۵۔ سائنس جن اشیاء یا مظاہر میں تحقیق و تفتیش کرتی ہے وہ خدا کی بنائی ہوئی مخلوقات ہیں خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات، جمادات ہوں یا سماوات اور ان مظاہر و مخلوقات کو ہم "افعال الٰہی" کہہ سکتے ہیں اور قرآن عظیم "اقوال الٰہی" کا مجموعہ ہے۔ لہذا خدا کے افعال اور اس کے اقوال باہم ایک دوسرے کے موید و مصدق ہیں نہ کہ ایک دوسرے سے متعارض و متصادم اور یہ حقیقت اس بات کی محکم دلیل ہے کہ یہ دونوں چیزیں (کائنات اور قرآن) ایک ہی سرچشمے سے صادر شدہ ہیں۔ یعنی جس نے یہ کائنات بنائی ہے اسی نے اس کلام برحق کو نازل کیا ہے ورنہ ان دونوں میں اس قدر مطابقت ہرگز نہ ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ قرآن عظیم کے برحق اور من جانب اللہ ہونے کی ایک محکم اور ناقابل تردید دلیل ہے، جس کو ایک اندھا بہرا شخص ہی نظر انداز کر سکتا ہے۔

مگر بعض لوگ اس تطبیق کو الٹا رخ دیتے ہوئے اسے "جدید سائنس سے مرعوبیت کا مظہر" یا "ایک معذرت خواہانہ انداز" قرار دے کر قرآن عظیم کی حقیقت اور اس کی قطعیت کے بارے میں تشکیک پیدا کرنا اور اس کے مقام و مرتبے کو گھٹانا چاہتے ہیں اور یہ قرآن فہمی نہیں بلکہ صحیح قرآن فہمی کا مذاق اڑانا ہے[۱۱]

۶۔ قرآن اور سائنس کی اس تطبیق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر

غلط اور اسلامی نقطۂ نظر صحیح ہے۔ لہذا اصلاح مادہ پرستوں کو کرنی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ہی تحقیقات کے ذریعے خود اپنے ہی خلاف حجت قائم کرلی ہے۔ اس اعتبار سے مادہ پرستوں کی تحقیقات خود انہی کے خلاف جارہی ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی اس "تحقیقی مہم" میں اس لئے جٹے ہوئے ہیں کہ وہ بزعم خود مادہ اور انرجی کے اسرار پوری طرح واشگاف کرکے ایک نہ ایک دن حتمی طور پر ثابت کردیں گے کہ اس کائنات میں نہ تو کسی "خدا" کا وجود ہے اور نہ ہی ہمیں اپنے ضابطۂ حیات میں اسے ماننے کی ضرورت ہے۔ مگر وہ اپنی تحقیقات میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہے ہیں ویسے ویسے وہ قرآن عظیم کی تصدیق وتائید کی "خبریں" ہی لارہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ انہیں اپنی اس مہم میں منہ کی کھانی پڑرہی ہے۔ کیا تاریخ فلسفہ اور تاریخ سائنس میں اس سے بڑھ کر عبرت ناک واقعہ اور کوئی ہوسکتا ہے جو مادہ پرستوں کو چاروں شانے چت کرنے والا ہو؟ خلاق عالم نے تو چودہ سو سال پہلے ہی بطور پیش خبری فرمادیا تھا

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم سجدہ: ۵۳)

ہم عنقریب ان منکرین کو اپنی نشانیاں (دلائل ربوبیت) دکھاتے رہیں گے، ان کے چاروں طرف اور خود ان کی اپنی ہستیوں میں بھی، تاآنکہ یہ حقیقت ان پر پوری طرح واضح ہوجائے کہ یہ کلام برحق ہے

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللَّهِ تُنكِرُونَ (مومن: ۸۱)

وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھادے گا، پھر تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرنے لگوگے؟

اس اعتبار سے آج عصر جدید کی تحقیقات کی روشنی میں منکرین حق پر اتمام حجت کرنے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آگیا ہے اور زمین اس کے لئے پوری طرح سازگار ہوچکی ہے۔



۷۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور سائنس کی اس تطبیق سے طبیعیات اور مابعد الطبیعیات میں تطبیق کا راستہ صاف ہوگیا ہے۔ کیونکہ جدید سائنسی تحقیقات کی تصدیق وتائید سے قرآنی "نظریۂ علم" کی تصدیق ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ علم صرف وہی نہیں ہے جس کو انسان اپنے محسوسات ومعقولات اور تجربے ومشاہدے سے حاصل کرتا ہے، بلکہ علم وہ بھی ہے جو وحی والہام کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کا اپنے انکشافات کے ذریعہ قرآنی بیانات کی تصدیق کرنا اس بات کا ناقابل تردید علمی ثبوت ہے کہ وحی والہام برحق ہیں اور جب وحی والہام برحق ہیں تو اس سے لازمی طور پر یہ حقیقت بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ انبیائے کرام کا سلسلہ اور ان کی تمام تعلیمات بھی برحق اور من جانب اللہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ اس طرح پورے سلسلۂ ایمانیات کی تجدید ہوجاتی ہے۔

۸۔ وحی والہام کے برحق ہونے پر چونکہ جدید علمی انکشافات کے ذریعہ پے درپے علمی ثبوت فراہم ہورہا ہے اس لئے انکشافات جدیدہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن عظیم نے نظام کائنات میں غور وفکر اور تحقیق وتفتیش کی دعوت اسی لئے دے رکھی ہے تاکہ اس کے نتیجے میں اصول دین (عقائد دین) کی صداقت کھل کر سامنے آجائے اور پھر کسی کٹر سے کٹر ملحد کو بھی اسلامی عقائد کی سچائی میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ کیونکہ جس کو مرنا ہو وہ دلیل دیکھ کر مرجائے۔

۹۔ جدید سائنس کے بارے میں ایک عمومی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ مادہ پرستانہ رجحان کی حامل ہے۔ مگر تجرباتی حقائق میں۔ جو خالص ہوں۔ اس قسم کے رجحانات کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے بالکل "غیر جانب دار" ہیں، جن میں نہ تو مادیت ہوتی ہے اور نہ روحانیت۔ مگر مادہ پرست ان آفاقی حقائق کو اچک لیتے ہیں اور ان پر مادیت کا "لیبل" چڑھا کر پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے عام لوگوں کو یہ دھوکا ہوجاتا ہے کہ یہ علوم اور

ان کی تحقیقات بذاتِ خود مادہ پرستانہ ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور مغربی فاضل محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) نے اس حقیقت کا تجزیہ اس طرح کیا ہے:

"علم بجائے خود نہ تو مغربی ہے اور نہ مشرقی۔ بلکہ وہ اسی طرح عام ہے جس طرح کہ طبیعی حقائق عام ہیں۔ ہاں البتہ انہیں جس نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا جاتا ہے وہ قوموں کے ثقافتی مزاج کے مطابق مختلف ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حیاتیات اپنے حیاتیاتی علم ہونے کے اعتبار سے اور اسی طرح طبیعیات اپنے طبیعی علم ہونے کے اعتبار سے نہ تو پوری طرح مادی ہیں اور نہ روحانی" [۱۱]

۱۰۔ جدید ترین علمی انکشافات کی بدولت آج قرآن اور سائنس میں دے کر قرآن کی عظمت و برتری ثابت کرنے کا کام آسان ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور فلسفی مصنف جوڈ تحریر کرتا ہے کہ وہ خلیج جو انیسویں صدی میں سائنس اور مذہب کے درمیان حائل تھی وہ اب بہت اچھے طریقے سے پاٹ دئے جانے کے قابل ہے۔

**The nineteen-century gulf between science and religion is in fair way to being bridged.** [۱۲]

اس اعتبار سے آج جدید سائنس قرآنی منشا و مقصد کے مطابق کام کر رہی ہے اور اپنے پورے "لاؤ لشکر" کے ساتھ قرآن عظیم کے منصوص بیانات پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے اس کے آگے "سجدہ ریز" ہو رہی ہے۔

## سائنس کو کس طرح اسلامی بنایا جائے؟

اس اعتبار سے آج سائنس نے "آدھا" کام انجام دیدیا ہے اور بقیہ "آدھا" اہل اسلام کو انجام دینا ہے اور وہ یہ ہے کہ کلامی نقطۂ نظر سے تمام سائنسی علوم کا جائزہ لے کر قرآن اور سائنس میں تطبیق دی جائے۔ یعنی



قرآنی حقائق اور قوانین فطرت میں مطابقت ثابت کر کے "آیات اللہ" کی تحقیق و تدوین کی جائے تاکہ اس عمل کے ذریعہ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے درمیان ربط و تعلق کی حقیقت واضح ہو سکے اور ان دونوں میں کسی قسم کا "اختلاف" دکھائی نہ دے۔

سائنسی تحقیقات دراصل وہ "علمی وثائق" یا "علمی امانتیں" ہیں جن کو خلاق فطرت نے اپنی معرفت کے لئے اپنی تخلیقات میں رکھ چھوڑی ہے۔ اگر اہل اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی ہے (اور اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے) تو ہم کو بے خوف ہو کر تخلیقاتِ الٰہیہ میں موجود حقائق یا خداوند قدوس کے "تخلیقی رازوں" سے استدلال کرنا چاہئے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ قرآن اور تحقیقات جدیدہ میں بغیر کسی "تاویل" کے اور صحیح "تفسیری اصولوں" کے تحت مطابقت ثابت ہو جائے۔ کیونکہ یہی منشائے الٰہی ہے جس کے لئے قرآن عظیم نے پر زور انداز میں نظام کائنات میں تحقیق و جستجو کی دعوت دی ہے اور مظاہر فطرت کی "نشانیوں" کو نظر انداز کرنے والوں اور اسی طرح "سمع و بصر" اور "فواد" کے ذریعہ حاصل ہونے والے علم سے مستفید نہ ہونے والوں کو بہائم اور چوپایوں سے تشبیہ دی ہے۔ لہٰذا اہل اسلام پر شرعاً یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ قرآن عظیم کی روشنی میں تمام جدید علوم کا تحقیقی مطالعہ کر کے قرآن اور سائنس میں تطبیق دیں، تاکہ الحاد و دہریت کا رد و ابطال ہو سکے۔

اب جہاں تک سائنسی علوم کے مادہ پرستانہ "رجحان" کا تعلق ہے تو وہ ایک ثانوی چیز ہے، بنیادی نہیں ہے۔ اگر ہم قرآن حکیم کی روشنی میں کام کریں تو موجودہ سائنسی علوم میں سرایت کردہ یہ مادہ پرستانہ رجحان یا اس کا کھوٹ دور کر کے ان علوم کو "مسلمان" بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ تجرباتی علوم اپنی اصل "طبیعت" کی رو سے مادیت کے حامل نہیں بلکہ مادہ پرست ان کی توجیہ اپنے مزاج کے مطابق کرتے ہوئے ان میں موجود "علمی شہادتوں" پر مادیت کا لیبل چڑھا

دیتے ہیں۔ اس طرح وہ عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

لہذا اب کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ حاملین قرآن سائنسی علوم میں پوری طرح دسترس حاصل کرکے مادیت کے اس کھوٹ کو نکال باہر کریں اور مظاہر فطرت کی خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح و توجیہ کرکے عالم انسانی کی صحیح رہنمائی کریں۔ یہ ایک عظیم عمل ہے اور اسے حاملین قرآن ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ تمام طبیعی وحیاتیاتی علوم میں دسترس حاصل کرلیں۔ پھر وہ مادہ پرستوں کا ہاتھ پکڑ کر بتاسکتے ہیں کہ انھوں نے اس باب میں ٹھوکر کہاں کھائی ہے۔ اس طرح تمام جدید علوم کی "تطہیر" ہوسکتی ہے اور اس عمل عظیم کے ذریعہ جو نئی سائنس برآمد ہوگی وہ "اسلامی سائنس" کہلائے گی۔ اس طرح موجودہ سائنس کو مادہ پرستوں کی من مانی تشریح سے بچایا جاسکتا ہے۔ اسلامی یا قرآنی سائنس وہ علم ہے جو طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے اختلاف کو مٹاکر ان دونوں کو ہم ساز و دم ساز بنادے۔ اسی عمل کے ذریعہ احیائے دین اور احیائے علم وجود میں آسکتا ہے۔ جو ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوگا۔

**قرآن جدید سائنس کا منبع**

واضح رہے جدید سائنس کا منبع قرآن عظیم ہے جس نے اپنے شرعی مقاصد کو بروئے کار لانے کی غرض سے اہل اسلام کو نظام فطرت کی تحقیق و تفتیش پر ابھارا اور اہل اسلام نے اس قرآنی منشا و مقصد کے مطابق اپنے سنہرے دور میں اس میدان میں کود کر تحقیقات کا آغاز کیا اور جدید سائنس کی داغ بیل ڈالی۔ پھر مسلمانوں کی فوجی و سیاسی میدان میں شکست کے بعد یہ علوم مغرب منتقل ہوگئے اور مسلم قومیں پس ماندہ بن کر رہ گئیں۔ سائنسی علوم جب تک مسلمانوں کے قبضے میں تھے ان کی تشریح و توجیہ خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے کی جاتی تھی۔ لیکن اہل مغرب کو یہ علوم راس نہیں آئے۔ کیونکہ اہل کلیسا (عیسائیوں کی لیڈر شپ) نے ان علوم پر "خلاف دین" ہونے کا فتویٰ صادر کرکے سائنس دانوں کو سخت سزائیں دیں۔ اس کے



نتیجے میں سائنس دانوں نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا۔ اس طرح الحاد و دہریت نے جنم لیا اور سائنسی علوم کی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح کی جانے لگی۔ لہذا اگر ہم ان علوم کو پھر سے گلے لگانا چاہتے ہیں تو ان میں سرایت کردہ مادیت کے جراثیم نکال باہر کرکے ان کی خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح کرنی ہوگی اور جب تک یہ کام نہ ہوا الحاد و مادیت کا زور ٹوٹ نہیں سکتا اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ عمل میں نہیں آسکتی۔

## حواشی

[1] کتاب الرد علی المنطقیین، ص ۴۳۹، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء [2] کتاب مذکور، ص ۹۴ [3] ایضاً ص ۹۶ [4] ایضاً ص ۹۸ [5] ایضاً ص ۲۶۷ [6] خلاصہ از کتاب مذکور ص ۲۷۳ - ۲۷۴ [7] ایضاً ص ۲۶۰ - [8] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۲/۱۰، مطبوعہ ۱۹۸۳ء [9] ملاحظہ ہو "دی نیو بک آف پوپلر سائنس" ۴/۳۸۳، گلوریل ان کارپوریٹڈ ۱۹۸۷ء [10] دیکھیے مجلہ "آیات" جلد ۱، شمارہ ۲ میں ضیاء الدین سردار کا مضمون بعنوان "دو آقاؤں کے درمیان"۔ [11] الاسلام علی مفترق الطرق (اسلام ایٹ دی کراس روڈ کا عربی ترجمہ) ص ۱۷، مطبوعہ بیروت ۱۹۷۴ء [12] C.E.M. Joad. Guide to Modern Thought, P 108 London.

# ثنای مشہدی

از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی*

بھلا ہو لکھنؤ کے منشی نولکشور کا کہ انھوں نے جن فارسی شعراء کے دواوین کو اپنے مطبع سے شایع کر دیا ان سے ہندوستانی عام طور پر آگاہ ہوئے لیکن جن کے شعری سرمایہ کو وہ کسی بنا پر طبع نہ کرا سکے وہ گمنامی کے گوشہ میں پڑے رہ گئے۔ عہد اکبری کے ایک لغز گو شاعر خواجہ حسین ثنای مشہدی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کا کلام تذکروں اور مخطوطات میں محفوظ رہ گیا اور عام طور پر لوگ ان سے روشناس نہ ہو سکے حالانکہ اگر ان کا کلام شایع ہو کر منظر عام پر آگیا ہوتا تو فارسی شاعری بہت سی جہات سے روشناس ہوتی اور اس میں کچھ نئے ابواب کا اضافہ ہوتا۔

ثنای کے نام سے بعض لوگوں کا ذہن بے اختیار مجد الدین آدم حکیم سنائی غزنوی (م ۱۱۳۱ء) کی طرف چلا جاتا ہے جب کہ دونوں کے زمانوں میں تقریباً ساڑھے چار سو سال کا فرق ہے۔

**عہد و ماحول** ثنای مشہدی کے کلام سے روشناس ہونے سے پیشتر ان کے عہد اور اس دور کے ہندوستان کے ماحول کو ذہن میں رکھنا چاہیے کیونکہ ایک شاعر بیک وقت اپنے عہد کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور اس کی پیداوار بھی اور اس عہد کے پس منظر کے بغیر اس کی

---

* ریڈر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔



شاعری کے صحیح خد و خال اور قدر و قیمت کا تعین مشکل ہوتا ہے۔

اکبری دور کی ذہنی سطح کی اہمیت و انفرادیت کو اگر بغور دیکھا جائے تو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ یہ زمانہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا تھا، برطانیہ میں اکبر کی ہمعصر ملکہ الزبتھ اول تھی جس کے زمانہ میں انگریزی کا سب سے بڑا شاعر شیکسپیئر موجود تھا۔ عام طور سے نشاۃ ثانیہ کو یورپ سے منسوب کیا گیا ہے۔ جرمنی میں مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک، فرانس میں ممتاز دانشور کا اجتماع، نیز ملکہ الزبتھ کے دور کو اسی نشاۃ ثانیہ کے آثار میں شمار کیا جاتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک صرف ادب ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا اظہار دوسرے وسائل سے بھی ہوا جیسے یورپی ملکوں بالخصوص برطانیہ کی بحری طاقت کا عروج، جس کی بنا پر سلطنتِ عثمانیہ جو آدھے یورپ پر قابض و متسلط تھی اب روبہ زوال ہونے لگی اور اس کا رعب و دبدبہ فرنگیوں کے دل سے کم ہونے لگا تھا۔ نشاۃ ثانیہ جسے انگریزی میں Renaissance (رِناساں) کہا گیا ہے اور جس کی مزید تشریح کے لئے دانشوروں نے Intellectual Awakening کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہم اسے ذہنی بیداری کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اکبر کے دور میں عجیب پُر اسرار طریقہ سے اس ذہنی بیداری کا ظہور نظر آتا ہے جس میں صرف ادب ہی نہیں بلکہ مذہب کے روایتی تصور پر تشکیک کا اظہار، اسلام کے ڈسپلن سے باہر نکل کر دوسرے مذاہب کی تعلیمات ان کے فلسفہ پر غور و فکر اور موشگافیاں، نصاب تعلیم میں اسلامیات کے علاوہ سائنسی مضامین اور معقولات کو داخل کرنا وغیرہ نظر آتے ہیں۔

امیر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل فیضی، ابوالفتح گیلانی وغیرہ کی مجالس کے مباحثے اور آزادیٔ فکر و خیال کا برملا اظہار ملا عبد القادر بدایونی جیسے متقشفین سے بالکل مختلف تھے۔

اکبر کا خود شعائر اسلامی سے کسی حد تک انحراف اور جدت پسندی اسی نشاۃ ثانیہ کی

نشاندہی کرتے ہیں لیکن ہمارے مورخین نے اس چیز کی باقاعدہ اس بنا پر شناخت نہیں کی کیونکہ وہ بھی عموماً دربار سے وابستہ ہوا کرتے تھے اور Established طرز فکر کے تابع تھے۔

نظیری نیشاپوری (۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء) نے شاہزادہ مراد کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے اس شعر میں اسی رجحان کی طرف غیر شعوری طور سے اشارہ کیا ہے۔

طبیعت ہمہ ابنای دہر ملحد شد ولی ز فطرت تو بر طرف فتاد الحاد

اکبر کے دور کے شعراء کو دراصل اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے اور اس پس منظر میں دیکھے بغیر عرفی، فیضی، خانخاناں، غزالی مشہدی، نوعی خبوشانی، ثنائی مشہدی جیسے شاعروں کی جدیدیت اور شعری اجتہاد سمجھ میں نہیں آسکتے اور نہ یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ فارسی کے اتنے بڑے شعراء کا بیک وقت مغل دربار کے زیر سایہ جمع ہو جانا کیسے ممکن ہوا۔ جو لوگ انگریزی و فارسی دونوں کے ادب سے واقف ہیں انہیں تصویر کے دونوں رُخ صاف صاف دکھائی پڑسکتے ہیں۔ اکبر و ملکہ الزبتھ دونوں کے یہاں بیک وقت اتنے بڑے شاعروں اور فضلاء کا جمع ہونا بڑا نادر اور قابلِ غور ہے۔

اس پس منظر سے واقفیت کے بعد ثنائی مشہدی (۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء - ۹۹۶ھ/۱۵۸۷ء) کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کے بارے میں معتبر تذکرہ نگاروں نے یہاں تک کہ خود ان کے معاصرین نے جن میں ملا عبدالنبی صاحب میخانہ اور ملا عبدالباقی نہاوندی صاحب ماثر رحیمی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مقبول ترین شاعروں میں تھے اور ان کا کلام دست بدست ہندوستان سے ایران وخراسان اور ماوراء النہر تک پہنچ جاتا تھا اور ہر گلی کوچہ میں لوگ اس کے شعروں کو پڑھتے اور ان کے دواوین خریدتے تھے۔



## حالات زندگی

ثنائی کے حالات زندگی جیسا کہ مولف مآثر رحیمی نے لکھا ہے ان کے خود نوشت دیباچہ کے دیوان میں لکھتے ہیں جن کو انہوں نے ماثر رحیمی میں نقل کیا ہے "چنانچہ خود در دیباچۂ کہ بر دیوان حقیقت بیان خود نوشتہ و متوجہ آن شدہ و سبب قدم در وادی شاعری نہادن خود درو مندرج ساختہ چنیں گوید[1]......

ثنائی مشہد میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام غیاث الدین علی تھا جو مشہد میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور بہت مشہور تھے۔ ثنائی اپنی جوانی کی ابتدا میں شعر نہیں کہتے تھے ایک روز خواب میں دیکھا کہ ہاتھ میں ننگی تلوار لئے کہیں جارہے ہیں، راستہ میں ایک بڑا پتھر ملا اور اپنی تلوار کی دھار کو اس پر آزما رہے ہیں۔ خواب ہی میں یہ خیال آیا کہ اس پتھر کو بنیر کی طرح تراش رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو اس کی تعبیر کے لئے پریشان ہوئے۔ عرصہ تک اس کی تعبیر سمجھ میں نہ آئی یہاں تک کہ ایک روز مشہد مقدس کے نواح میں ایک بزرگ کے مزار پر گئے، جہاں دیکھا کہ ایک بچہ کچھ پراگندہ اوراق ان بزرگ کے مزار پر بکھیر کر بھاگ گیا۔ ثنائی نے ان اوراق کو پڑھنا چاہا تو دیکھا کہ ایک ورق پر لکھا تھا کہ حضرت شیخ حسن بصری قدس سرہٗ نے بچپن میں خواب دیکھا کہ مسجد میں ایک چھری ہاتھ میں لئے پہنچے اور اس سے مسجد کے پتھروں میں سوراخ کرنے لگے۔ دوسرے روز انہوں نے یہ واقعہ والدین سے دہرایا وہ ان کو ابن سیرین (جو تعبیر بتانے والوں کے استاد تھے) کے پاس لے گئے اور خواب بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ "تو صاحب سلوک شیخ بنے گا اور تیری باتیں لوگوں کے دلوں میں بہت اثر کریں گی"۔ ثنائی نے یہ باتیں بالکل اپنے حسب حال سمجھیں، اس پر فال لی اور شاعری کرنے لگے اور یہ سمجھ کر کہ مبدء فیاض نے اپنے فیض کا دروازہ ان پر کھول دیا ہے شعر کہنے لگے اور جو کچھ کہتے وہ

[1] مآثر رحیمی۔ ملا عبدالقادر نہاوندی سنہ تالیف ۱۰۲۵ھ کلکتہ ۱۹۳۱ء جلد سوم ص ۳۵۳۔

حال و رتبہ سے خالی نہ ہوتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اللہ کی رحمت و کرم سے شہرت کے بام پر پہنچ گئے۔

شاہ طہماسپ صفوی نے جب اپنے بیٹے سلطان ابراہیم مرزا کو مشہد مقدس کی حکومت سے سرفراز کیا اور شہزادہ وہاں پہنچا تو اکثر ارباب طبع و دانش کو دربار میں بلایا اور ان پر احسان و اکرام کیا۔ ثنائی بھی بلائے گئے جنھوں نے راستہ میں اپنا ساقی نامہ کہہ کر پیش کیا۔ بادشاہ کو پسند آیا اور ثنائی اس کی عنایت سے سرفراز ہوئے۔[1]

ایک زمانہ گذر گیا تو نیشاپور کے نواح میں سلطان ابراہیم مرزا نے ایک روز قزاق خاں اور گروہ تکلو کے رفع شر و دفاع کے لئے ایک مجلس شوریٰ طلب کی۔ اس نواح کے تمام امراء حاضر ہوئے اور استخارہ و مشورہ کے بعد سب کی یہ رائے ہوئی کہ معصوم بیگ کو ان کے دفع شر کے لئے متعین کیا جائے۔ بعد ازاں ابراہیم مرزا اپنے شعراء کی مجلس میں مشغول ہو گیا۔ اور ثنائی سے کہا کہ اس قصیدہ کا تتبع کرو۔

می رسم از گرد راہ رقص کناں چوں صبا　　　باد جنوں در دماغ عاشق و سر در ہوا

ثنائی نے حسب الحکم قصیدہ منظوم کر کے پیش کیا۔ بادشاہ کو بہت پسند آیا اور اسی وقت ان کو نہ صرف اپنا ندیم خاص بنا لیا بلکہ حکم دے دیا کہ خلوت و جلوت میں ان کو آنے سے نہ روکا

---

[1] بیا دل بہ میخانہ اہل راز　　　بخش جام معنی صورت گداز

چناں خویش را کن ز صورت بری　　　کہ از دیدہ گردی نہاں چون پری

.....................　　　.....................

چناں در فشانی کنم در سخن　　　کہ جان نظامی در آدم تبن

کشایم در مخزن فکر را　　　نمایم بتو معنی بکر را

ثنائی دریں خود نمائی میای　　　بحرف ازین خوب تر لب کشائی

یہ ساقی نامہ "میخانہ عبد النبی" میں ۱۷۱ اشعار پر مشتمل درج ہے۔ ۱۲ منہ



جائے۔ اس قصیدہ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں (اس میں ۴۰ اشعار ہیں)

در روش حسن و ناز ہست لبی خوش نما　　　غمزہ بطرز ستم عشوہ برنگ جفا

گر بہ مثل جا کنی در پس آئینہ شخص　　　بیند تمثال خویش تافتہ رو بر قفا

مردۂ صد سالہ را دادہ خرامت حیات　　　فتنۂ افتادہ را آمدہ قدت عصا

می کشدم خندہ ات این سخت یاد باد　　　کز تو نہ خواہم جزا این روز جزا خون بہا

آں بت بیگانہ را گر شوم آئینہ دار　　　نایدش اندر نظر صورت خویش آشنا

ابراہیم مرزا (۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء) کی زندگی تک ثنائی سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے ان ہی دنوں شاہ اسمٰعیل ثانی شاہ طہماسپ کے قید خانہ سے رہا ہو کر اپنے والد کی جگہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ ثنائی خدمت میں پہنچے اور تہنیت میں ایک قصیدہ تیس اشعار پر مشتمل پیش کیا۔

بر تخت جم سکندر گیتی ستاں نشست　　　یوسف ز چہ برآمد و بر آسماں نشست

شاہا اگر ز اختر بد ہر مدتی　　　در سنگ خارہ ذات تو فولاد ساں نشست

با ایں سپہر مصلحتی داشت زاں کہ تیغ　　　برندہ در شود چو بہ سنگی فشاں نشست

اس قصیدے سے ان کی زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت اور فکر و خیال کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر گردش روزگار کی بنا پر شاہ کو پسند نہ آیا اور اعتراض کیا کہ میرا نام اس قصیدہ میں نہیں آیا یہ قصیدہ مرزا ابراہیم حسین کے لئے کہا تھا جواب مجھے پیش کر رہے ہو اور بجائے اس کے کہ صرف نظر کرتا، ثنائی سے بہت ناراض ہوا۔ ثنائی جان کے خوف سے وہاں سے فرار ہو گئے اور ایران سے ہندوستان آ کر اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء-۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کی بارگاہ میں باریاب ہوئے اور ایک عرصہ تک بادشاہ موصوف کی خدمت میں رہے،

یہاں تک کہ ۱۰۹۵ھ یا ۱۰۹۶ھ (۱۶۸۴ء یا ۱۶۸۵ء) میں لاہور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ بعد میں ان کی ہڈیاں مشہد میں لے جاکر سپرد خاک کر دی گئیں[1]

**شاعری**

ثنائی کے دیوان کے اشعار کی تعداد تین ہزار سے زائد ہے۔ صاحب میخانہ کے بیان کے مطابق مثنوی کی بحر میں لکھا ہوا سکندر نامہ[2] ۷۵۰ (ساڑھے سات سو اشعار) پر مشتمل تھا (اگرچہ یہ بیان سماعی ہے) ساقی نامہ اس کے علاوہ ہے۔ افسوس ہے کہ ثنائی کا دیوان اب تک طبع نہ ہو سکا ہے (جہاں تک راقم السطور کا علم ہے)

اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں ہیں۔ علی گڑھ میں میرے علم میں اس کے پانچ[5] نسخے موجود ہیں۔

۱۔ قطب الدین کلکشن ۱۲۷/۵، سطر ۱۵ ورق ۱۱۲۔

۲۔ حبیب گنج کلکشن مسلم یونیورسٹی، ۴۹/۱۴ (۳) ف ۴۷/۳۷ (۴) ف ۴۹/۱۹ ف۔

۵۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہادر مرحوم (مزمل لائبریری ۹۱۵) ورق ۱۲۰، سطر ۱۵[3]

---

[1] یہ تمام حالات معمولی رد و بدل کے ساتھ ملا عبدالباقی نہاوندی اور ملا عبدالنبی قزوینی نے بالترتیب مآثر رحیمی اور میخانہ میں درج کئے ہیں۔ ثنائی کے حالات میں یہ دونوں تذکرے بنیادی اہم مآخذ ہیں۔ ۱۲ منہ [2] یہ مثنوی سکندر کے حالات میں ہے اور اکبر کے نام پر لکھی گئی۔ اسے سد سکندر اور باغ ارم بھی کہتے ہیں [3] راقم السطور نے پانچوں قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہے مگر بالاستیعاب مطالعہ اسی نسخہ سے کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر زیر نظر مقالہ سپرد قلم کیا جا رہا ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کی بنا پر بڑی ناسپاسی ہوگی اگر خلف سلف مکرمی نواب محمد رحمت اللہ خاں صاحب شروانی زید لطفہ کا شکریہ ادا نہ کر دیں جنھوں نے نہ صرف اس نسخہ سے استفادہ کا شرف بخشا بلکہ بڑی فراخ دلی و کشادہ روی سے مآثر رحیمی، میخانہ عبدالنبی اور ریاض الشعراء سے بھی استفادہ کا موقع دیا۔



۶۔ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں بھی ثنائی کا ایک دیوان اور رباعیات کا ایک عمدہ نسخہ موجود ہے (۱۵۱/۱)

اول الذکر پانچوں نسخوں میں معمولی فرق کے ساتھ مختلف شخصیات کی شان میں مدحیہ قصائد کی تعداد ۸۷ ہے جن میں کم و بیش ۲۳۱۹ اشعار ہیں۔

ثنائی بنیادی طور پر قصیدہ کے شاعر ہیں مگر پھر بھی ان کے دواوین کے آخر میں تقریباً ۸۵ غزلیں مختلف ردیفوں میں موجود ہیں۔

الف ۳، ب ۱، ت ۱۲، د ۷، ز ۱، ش ۳، ل ۲، م ۱۵، ن ۱، و ۲، ۱۵، ی ۳۔

ان غزلوں کے علاوہ سوا سو سے زائد رباعیات ہیں جن سے ان کی طبیعت کی جولانی کا پتہ چلتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مذکورہ نسخوں کی مدد سے ان کا ایک دیوان مرتب کر لیا جائے۔ ثنائی کے قصائد بعض جہتوں سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور چونکہ ان کا دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس لئے تمام قصائد کا ایک اجمالی تعارف مع کچھ اشعار کے درج کیا جا رہا ہے۔ ثنائی پر باقاعدہ کام کرنے کی ضرورت ہے اور اس حیثیت سے وہ یقیناً مظلوم ہیں۔

۱۔ در مدح سلطان ابراہیم مرزا :-

در روش حسن و ناز ہست لبی خوشنما ۔ غمزہ بطرز ستم عشوہ برنگ جفا ۳۰ اشعار

۲۔ در منقبت حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ :-

ای طعنہ زن زروی تو گوہر بر آفتاب ۔ وی در عرق چو روی تو از گوہر آفتاب ۳۲ "

۳۔ سلطان مرزا ابراہیم حسینی کی مدح میں جب وہ طہماسپ کی قید سے رہا ہوئے۔

بر تخت جم سکندر گیتی ستاں نشست ۔ یوسف ز چہ بر آمد و بر آسمان نشست ۳۰ "

۴۔ در مدح مرزا ابراہیم حسین :۔

زغلغلی کہ بفتح خدایگاں برخاست　　نشاط خفتہ ز آغوش آسماں برخاست ۱۸ اشعار

۵۔ امام خاقانی کے تتبع میں فخریہ قصیدہ :۔

الحذر کاتش از زبان برخاست　　دوم از مغز استخوان برخاست ۱۳

۶۔ شاہ طہماسپ حسنی صفوی کی شان میں اس کی بیماری سے صحت یاب ہونے پر :۔

شکر خدا کہ خسرو صاحبقران خوش ست　　وز لطف کردگار خدیو جہاں خوشست ۱۵ "

۷۔ حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں :۔

کمند زلف تو کانرا بود ہزار شکست　　ہر شکست دلم را ہزار بار شکست ۳۲ "

۸۔ مرزا ابراہیم حسین کی تعریف میں :۔

ای بردہ در طراوت دست از بہار دست　　از خون کیست باز ترا در نگار دست ۴۹ "

۹۔ خاقانی شروانی کے طرز پر فخر و مباہات کے ضمن میں :۔

صبح روشن دلاں بیان من است　　تیغ صبح سخن زبان من است ۵۰ "

۱۰۔ شیخ ابوالفتح گیلانی کی تعریف میں :۔

چو صبح دست دعا سوی آسمان برداشت　　مراد ہای تو مہر از سر زباں برداشت ۲۰ "

۱۱۔ ایضاً :۔

مست نازم ز سر عتاب گرفت　　شوق در کشتنم شتاب گرفت ۵۲ "

۱۲۔ در مدح عبدالرحیم خانخاناں :۔

باز تیغ زبان سخن گہر است　　سخنم بر سخن نثار گر است ۳۷ "

خانخاناں کہ خاک در گہ او　　دیدۂ آفتاب را بصر است



قبلہ عبدالرحیم خاں کہ اماں　　در حریم درش جو کعبہ در است

۱۳۔ در منقبت حضرت امام مہدی آخر الزماں :۔

درد خدنگت بجاں لذت درماں شکست　　خار جفایت بدل رونق بستاں شکست ۱۳ اشعار

۱۴۔ در مدح نا معلوم :۔

صبحی کہ ہمچو چشم نرم پاک دامن است　　از شست و شوی اشک سحرگاہی من است ۱۱ "

ساقی یکی نظارۂ رخسارہ صبح کن　　منعم مکن ز نالہ کہ ہنگام شیون است

۱۵۔ فخر و مباہات کے اظہار میں :۔

باز ہنگام پیچ و تاب من است　　شوق را میل اضطراب من است ۲۰ "

۱۶۔ ایضاً۔ خاقانی کی پیروی میں :۔

کنہ سخنم بیاں ندیدا است　　اندیشہ از آں نشاں ندیدا است ۳۴ "

بر خوان سخن معانی من　　مغزیست کہ استخواں ندیدا است

۱۷۔ فخر و مباہات کے سلسلہ میں :

باز آہم در دعا ز دور رفت　　نہ فلک را بہ پشت پا ز دور رفت ۸ "

۱۸۔ در مدح سلطان بیگم والدہ مرزا ابراہیم :۔

زہی ز زہد نہ گنجید در جہان صلاح　　رسانده افسر عصمت بر آسمان صلاح ۱۸ "

۱۹۔ حکیم ابوالفتح گیلانی کی شان میں :۔

بی نام خوشت زبان نجنبد　　بی کام تو آسمان نجنبد ۱۱ "

۲۰۔ ایضاً :۔

از دل غم دلستان نجنبد　　دل خون شد و غم ہماں نجنبد ۳۱ "

۲۱۔ عبدالرحیم خانخاناں کی تعریف میں، خاقانی کی پیروی کرتے ہوئے :۔

چوں در سخنم زبان نجنبد    زیر لبم آسمان نجنبد ۳۳ اشعار

۲۲۔ در مدح نامعلوم الاسم :۔

تا دل بنا امیدیم از بار نشکند    دل را فریب وعدہ بیکبار نشکند ۳۷ "

۲۳۔ در منقبت حضرت امام مہدی :۔

نقد ہر جنسی کہ کان اندر دکاں می آورد    بہر ایثار شہ صاحب قرآں می آورد ۳۸ "

۲۴۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی شان میں :۔

چو شوق بندگی کہ عنت اختیار کرد    نقد بقا براہ محبت نثار کرد ۳۱ "

۲۵۔ اپنی فصاحت کے اظہار میں :۔

مگر حرفی ز رایم صبح صادق برزبان دارد    کہ در برہان دعوی آفتاب اندر دہان دارد ۱ "

۲۶۔ حضرت امام مہدی آخر الزماں کی تعریف میں :۔

منم نوحی کہ طوفان جہان را در امان دارد    بہ بہبودی کساں دست دعا بر آسمان دارد

۲۷۔ حضرت امام زین العابدینؓ کی شان میں :۔

صبح چو خندۂ طرب بر رخ عاشقاں زند    اشک شکوہ کوہ من کو بہ آسمان زند ۲۷ "

۲۸۔ سلطان مازندرانی کی تعریف کرتے ہوئے، ظہیر فاریابی کی اتباع میں :۔

شوقم نوید عشق گلی از فغاں دہد    این اضطراب دل ز محبت نشاں دہد ۴۳ "

۲۹۔ حضرت ابوالحسن علی موسیٰ کی تعریف میں :۔

ہجوم غمزہ چو از چشم یار برخیزد    ز جان غمزدگاں اعتبار برخیزد ۳۲ "

۳۰۔ خاقانی کے تتبع میں :۔



دیدہ را اشتیاق شب ہمی گر گریاں دیدہ اند    چشم را چوں چشم گریاں بدامان دیدہ اند ۲۶ اشعار

۳۱۔ مرزا یوسف خاں مشہدی کی تعریف میں :۔

وقت آں شد کہ مرا کار بسامان گردد    در حق من فلک از کردہ پشیمان گردد ۲۰ "

۳۲۔ موسم سرما کی تعریف میں :۔

درستی صورت دگر نیست ممکن    و بس نطفہ در بطن ما در بلرزد ۱۶ "

۳۳۔ شہنشاہ اکبر کی کابل سیر سے لاہور واپسی پر مبارکباد :۔

منت خدای را کہ شہ دادگر رسید    خورشید فتح سر زدہ روز ظفر رسید ۲۵ "

از ذوق خلق غلغلہ در قدسیاں فتاد    از بانگ شور گوش فلک را خبر رسید

۳۴۔ ابراہیم شاہ کی تعریف میں :۔

حسنت اندر نظر نمی گنجد    نمکت اندر جگر نمی گنجد ۳۱ "

۳۵۔ شاہ منصور کی تعریف میں :۔

زلفت چو رقم بکین نویسد    صد فتنہ بہر کمین نویسد ۳۲ "

۳۶۔ مرزا خان کی مدح میں :۔

باز امیدی بچشم راہ خوابی میزند    صحن دل را شوقم از خون بازآبی میزند ۳۰ "

۳۷۔ نوروز کے بیان میں :۔

نوروز آمد و ہمہ را وصل یار داد    ما را بیاد گریہ بی اختیار داد ۲۱ "

۳۸۔ شاہ ابراہیم کی شان میں :۔

چنانکہ در رگ آزردہ نیشتر گنجد    بجان خستہ مرا غمزۂ تو در گنجد ۲۳ "

۳۹۔ ایضاً :۔

بہفت گنبد افلاک در نمی گنجد　　سری کہ پیش تو بر خاک رہگذر گنجد ۱۱ اشعار

۴۰۔ عشق کے بیان میں :-

عشق ہر جا سخن در اندازد　　زہرہ اش بر زیان بر اندازد ۱۲ ،،

۴۱۔ ابوالفتح گیلانی کی تعریف میں :-

پردہ چوں از رخاں بر اندازد　　رستخیزی بجاں در اندازد ۶۱ ،،

۴۲۔ شاہ ابراہیم کی تعریف میں :-

ہیچ دل خستہ وصالی تو تخیل نہ کند　　کز نومیدی جاں باز تغافل نہ کند ۲۱ ،،

۴۳۔ ،، ،،

حرفی کہ از جفای تو دل بر زبان نہاد　　جز دل دگر کہ گوش تواند بر آں نہاد ۴۲ ،،

۴۴۔ ،، ،،

ازین بنا کہ شہنشاہ کامراں افگند　　زمین کلاہ بشارت بآسمان افگند ۱۴ ،،

۴۵۔ ،، ،،

زتاب مہر برا فروخت آنچناں گوہر　　کہ شمع ساں زند آتش بر آسماں گوہر ۳۹ ،،

۴۶۔ محمد بن شاہ کی مدح سرائی کرتے ہوئے :-

ہزار شکر کہ از فضل ذوالجلال کبیر　　عزیز مصر جہاں گشت یوسف کشمیر

ہزار شکر کہ آمد برون زچاہ محاق　　بعون طالع مسعود ماہ مہر منیر ۱۸ ،،

ہزار شکر کہ غم رفت از میان و رسید　　بکام خویش شہنشاہ بی مثال و نظیر

۴۷۔ امام ابوالحسن علی بن موسیٰ جعفرؒ کی تعریف کرتے ہوئے :-

مرا در نظر دوش ازین نخل اخضر　　ثریا نمودی چو باری صنوبر ۱۷ ،،

(باقی)



# موجودہ عربی ادب میں سعودی خواتین کا حصہ

از ڈاکٹر شہاب الدین صدیقی ٭

چودھویں صدی ہجری کی آٹھویں دھائی میں سعودی حکومت نے خواتین کی تعلیم پر اپنی توجہ خاطر خواہ طور پر مبذول کی؟ اس کی وجہ سے سعودی خواتین کی علم و ادب سے دلچسپی بڑھی اور ان میں بھی اظہار خیال کا حوصلہ پیدا ہوا اس طرح موجودہ سعودی ادب میں بعض خواتین کے نام بھی نظر آنے لگے جو مختلف اصناف ادب نظم، افسانہ، ناول، ڈرامہ اور مقالہ نگاری وغیرہ میں اپنا جوہر دکھا رہی ہیں۔ مگر ابھی تک خواتین کی ادبی کاوشوں کو سعودی ناقدین نے زیادہ لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ اس مضمون میں بعض خواتین کی ادبی خدمات اور کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ غادۃ الصحرا : موجودہ سعودی خواتین میں ادبی حیثیت سے بہت نمایاں نام مشہور شاعرہ غادۃ الصحراء کا ہے۔ گو اس مقبول سعودی شاعرہ کے حالات زندگی اور شخصیت پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں تاہم اس کی ادبی کاوشیں، افکار و نظریات اپنا گہرا نقش چھوڑ رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ اس کی شاعری پر گفتگو کرنے والوں نے اس کی شخصیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ مشہور مورخ ادب الشیخ بکری امین نے اپنی مشہور کتاب "الحرکۃ الادبیۃ فی المملکۃ العربیۃ" میں غادۃ الصحرا کے بارے میں صرف اس قدر

---

٭ استاد عربی، منٹو سرکل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

لکھنے پر اکتفا کیا ہے:

"یہ ایک شاعرہ کا رمزی نام ہے اصل نام نہیں ہے شاعرہ کسی معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شخصیت پر ہنوز اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں اس خاتون کو فیاضی کے ساتھ شاعرانہ صلاحیت قدرت نے عطا کی ہیں۔ تاریخ ادب میں اس کا تذکرہ عصر حاضر کی بلند پایہ غزل گو شاعرہ کی حیثیت سے کیا جائے گا۔"

اس کی غزلوں میں شوق کے ساتھ کرب اور سوز دل کے عناصر بھی شامل ہیں۔ غادۃ الصحرا کی جراحت اور سوزش کو زائل کرنے کے لئے بارش کی سخت ضرورت ہے۔ بادل گرج چمک کے ساتھ اٹھتے ہیں مگر برسے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی پُر امید نگاہیں ترستی ہوئی ان کا تعاقب کرتی ہیں۔ کچھ دیر بعد چونک کر جب وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتی ہیں تو وہ تنہا صحرا میں کھڑی ملتی ہیں جہاں کسی متنفس تو در کنار جنگلی پھول کا بھی وجود دور تک نہیں ہوتا۔ گو وہ یہ تسلیم کرتی ہیں کہ بوئے گل کی طرح محبت مقید نہیں رہ سکتی تاہم وہ اپنے محبوب کے لطف و نوازش کو محض اپنے ہی تک محدود رکھنے کی متمنی دکھائی دیتی ہیں۔

لیت حبیبی یصیر حبّی　　　حبّی لا یعرف الحدود

ایک دوسرے شعر میں کہتی ہیں۔

بلا دموع بلا ذل بلا غصص　　　والحب أوجعه ما كان كتمانا

یعنی جس محبت میں آنسوؤں، خواریوں اور غم و اندوہ کا اظہار نہ ہو سکے اس کو پوشیدہ رکھنا کتنا اذیت ناک ہے۔

لیکن اشکوں کی نمی کبھی کبھی لوگوں کی حیرت کے ساتھ چہ میگوئیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ ایک خاموش سوال معلوم ہوتی ہے۔ گویا ہر آدمی اس جان لیوا



روگ کی تفصیل جاننے کے لئے بے قرار ہے۔ آخر بوئے مشک پھیل ہی جاتی ہے۔۔۔۔۔

میری سہیلیوں نے مجھے بدنام کرنے کو یہ خبر اڑا دی کہ تم میرے ہو گیا میں ان کی خبر کی تردید کر دوں جس سے میرے غم ہلکے ہوگئے ہیں؟ مجھے صاف صاف بتا دو کیوں کہ اب حیرت میرے وجود میں درد بن چکی ہے۔ اڑ کر میرے پاس پہونچو کہ میرے ندیم بن جاؤ میں تم پر قربان ہو جاؤں گی۔ (دیوان شمیم العرار)

غادۃ الصحرا کی شاعری میں فطرت کی مکمل عکاسی، قدرتی مناظر سے ان کا لگاؤ اور نجدی و صحرائی زندگی سے تعلق نمایاں ہے وہ اپنے وجود کو وسیع و عریض صحرا کا ایک حصہ کہتی ہیں جو ویرانی تشنگی، تنہائی، اذیت اور تپش کے احساس سے عبارت ہے۔ اپنے دیوان کے صفحہ ۹۰ پر ایک غزل میں وہ اپنی ہستی کو فکروں بھری رات اور صحرا کی تپش میں بھٹکنے سے تعبیر کرتی ہیں۔ جہاں نہ کوئی شجر سایہ دار ہے نہ شبنم کے قطرے ہیں بس محبت اور اس کی مہک ہے۔ اس لق و دق صحرا میں نہ کہیں پانی گرنے یا بہنے کی آواز ہے نہ اس کا تصور، نہ خیموں میں چاند و سورج کا گزر ہے بس مونس و مددگار ایک تیز دھار والی تلوار ہے۔۔۔۔۔۔

ان اشعار میں غادۃ الصحرا نے حرماں نصیبی، تلخی اور محرومی کے حوالے سے اپنی ذات کا بڑا موثر تجزیہ کیا ہے۔

غادۃ الصحرا کا کلام لبنانی شعراء سے اس حد تک متاثر ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں نجد کی روح، اس کی وادیوں اور نخلستانوں اور صحرا کے ماحول کے علاوہ سب کچھ لبنانی ہے۔ خصوصاً ان کی شاعری کا سرگوشی کا انداز، قصائد کی ہیئت اور اوزان و قوافی سب کچھ لبنانی شعراء سے متاثر ہیں۔ خصوصاً اخطل الصغیر کے یہاں یہ خصوصیات بدرجۂ اتم ہیں۔ غادۃ الصحرا کے دو شعری مجموعے "شمیم العرار" اور "عینائی" ۱۹۶۳ء میں بیروت

سے طبع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔

۲۔ ثریا قابل: غادۃ الصحرا کے بعد دوسرا اہم نام ثریا قابل کا ہے جن کا تذکرہ عبد السلام الساسی نے "الموسوعۃ الادبیۃ" میں اس طرح کیا ہے کہ ان کی پیدائش سنہ ۱۹۴۳ء میں جدہ میں ہوئی۔ ان کا شمار ان چند اولین تعلیم یافتہ سعودی خواتین میں ہوتا ہے جن کی اعلیٰ تعلیم نصف صدی قبل بیروت کے "کلیۃ الاھلیۃ" میں مکمل ہوئی قاہرہ میں ایک صحافی اور مقالہ نگار کے علاوہ انہوں نے اپنے اشعار کی وجہ سے بھی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ان کی شاعری موزوں اور اوزان و قوافی سے آزاد دونوں طرح کی ہے ان کا شعری دیوان "الاوزان الباکیۃ" ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آچکا ہے جس میں وطن عربی کے اہم مسائل پر ان کے قلبی احساسات کی ترجمانی ہے۔ خصوصاً وہ نظم بہت ہی اثر انگیز ہے جو انہوں نے عظیم مجاہدہ جمیلہ بوحیرد کے نابینا ہونے پر کہی تھی۔ ملاحظہ ہو:

اگر تم نابینا ہوگئیں یا وہ روشنی ماند پڑگئی جس نے میرے وطن میں شمعیں روشن کی تھیں جنھوں نے مجھے اور میرے وطن کو استقامت عطا کی تھی، میری قوم کو عزت اور میری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی تھی۔ اگر تم نابینا ہوگئیں تو امیدوں کا دامن نہ چھوڑو ... میری آنکھوں کی روشنی حاضر ہے .... (منقولہ از الموجز تاریخ الادب السعودی" صفحہ ۲۷۰)

ثریا قابل کے چند اہم مقالوں سے جو عالم عربی کے معیاری جرائد میں طبع ہوئے ان کی صحیفہ و مقالہ نگاری کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کا ایک انشائیہ جو "السیاسۃ .... فن و دھاء" کے عنوان سے منظر عام پر آیا، پُرمغز ہے اس میں لطیف طنزیہ پیرایے میں سیاست اور اہل سیاست کی شعبدہ بازیوں کا بیان ہے۔ یہ انشائیہ طنزیہ کے ساتھ



المیہ بھی ہے جس میں سیاست کے گھناؤنے پن کے باوجود موجودہ دور میں اس کی بالادستی کا اعتراف بے بسی سے کیا گیا ہے، مقالے کے کچھ حصے کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"... سیاست کا یہ عالمی اسٹیج ہے۔ سیاست فن ہے، مکر و فریب ہے، دیوانگی ہے، عیاری ہے، اس فن کا خاص ترکیبی پروپگنڈہ ہے۔ اس کے مکر و فریب میں سازش فتنہ پردازی منافقت، دورخاپن، موقع پرستی اور عیب جوئی ہے۔ اس کی دیوانگی کی علامت، نیرون اور اسرائیل ہیں، امن کے لئے گفت و شنید ہے اور جنگ بھی ہے۔ اس کا پُرپیچ اور عیارانہ انداز کہاں نمایاں نہیں ہے؟ (منقول از کتاب" ادب المرأۃ السعودیۃ" مولف عبد الکریم العقیل)

ثریا قابل نے شعر و سخن میں اپنا جوہر دکھانے کے علاوہ سعودی خواتین میں ادب و فن کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے مشہور شاعرہ سلطانہ سدیری کے ساتھ مل کر بڑا کام کیا ہے "الجمعیۃ الخیریۃ النسائیۃ" جیسا رفاہی ادارہ قائم کرکے "امسیات الشعریۃ" یعنی خواتین میں شعری نشستوں کو رواج دیا۔

۳۔ رقیہ ناظر: اس ضمن میں ایک اور شاعرہ رقیہ ناظر کا نام بھی نمایاں ہے جن کی شاعری کو حقیقتوں کا شاعرانہ بیان کہا جاسکتا ہے یہی خصوصیت ان کے مضامین کی بھی ہے، جو عالم عربی کے معیاری اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں ان کا شمار ادبا کی اس نسل میں ہوتا ہے جو "خمسینات" یعنی اس صدی کی پانچویں دہائی میں مطلع ادب پر ابھری۔ ان کے تفصیلی حالات زندگی دستیاب نہیں ہوسکے۔ ان کے مشہور قصیدہ "سدت السبل" جریدۃ الندوۃ کے عدد ۸۸۰، میں ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۵ھ کو شایع ہوا ہے جو عورت کی نفسیات اور شوہر سے ذہنی و جسمانی قربت کی اہمیت و حقیقت

کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا مفہوم ملاحظہ ہو۔

"یہ چند اشعار ایک ایسی بیوی کا شکوہ ہے جو اپنے شوہر اور گھر والوں کی زیادتی کا شکار ہے۔ شوہر کی زیادتی اپنی بیوی سے دوری ہے جو دوسری تمام اذیتوں سے بڑھ کر ہے۔ زمانے کے جور و ستم اس کے لئے قابل برداشت ہیں جن کو وہ زبان شکایت پر نہیں لاتی۔ لیکن شوہر سے دوری کے سبب اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ شوہر اس کی بڑھتی ہوئی عمر بیقراری اور غم ہجر کی کیفیات دیکھ کر حیرت بھی کرتا ہے اور یقین بھی دلاتا ہے کہ نادان نہ بن اور بے بنیاد مفروضوں کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دے کیونکہ میرے خانۂ دل میں اب بھی تو ہی تنہا مکین ہے۔ یہ سُن کر اس کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑتی ہیں اور وہ کہتی ہے

اب میری راہیں آسان ہو گئیں۔۔۔۔۔۔

نثر کے میدان میں رقیہ ناظر کے جو مقالات شایع ہوتے رہے ہیں ان میں اکثر سماجی موضوعات پر ہیں۔ ان سے ان کی فہم و فراست اور معاشرہ کے تئیں اپنے فرائض کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے آسان اور عام فہم انداز و اسلوب نے مضامین کی افادیت اور تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ ایک مقالہ "الحریۃ" میں انہوں نے انسان کی انفرادی آزادی اور ان کی سماجی تحدید کا آفاقی اصول بیان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

"انسان کو آزادی سے متمتع ہونے کا موقع اور حق یقیناً دیا گیا ہے مگر ہمارا یہ حق وہاں سلب ہو جاتا ہے جہاں ہماری آزادی دوسروں کی آزادی کو نقصان پہنچانے لگے جب ہمارا تصرف آزادی دوسروں کے لئے باعث اذیت بن جائے تو ہمارے تصرف پر روک لگ جاتی ہے۔۔۔۔ چنانچہ آزادی کی کچھ حدود و شرائط مقرر کر دی گئی ہیں۔



جو لوگ اس کے برعکس سمجھتے ہیں وہ جہالت کا شکار ہیں اور ان میں فہم و ادراک کی کمی ہے"۔

(دیکھئے کتاب ادب المرأۃ .... صفحہ ۴۳، لعبد الکریم العقیل)

مذکورہ بالا کتاب میں ان کا ایک اور مقالہ" بین سوء الخلق و قوۃ الشخصیۃ" کے عنوان سے شامل ہے جس میں حسن اخلاق کو انسانی شخصیت کی قوت اور بد خلقی کو اس کی کمزوری سے تعبیر کیا گیا ہے اور دونوں کے فوائد و مضرات کا تجزیہ نہایت موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ مقصدیت سے پُر یہ انداز نگارش رقیہ ناظر کی پہچان بن گئی ہے۔

۴۔ **خیریہ سقاف**: مقالہ نگاری میں ان کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے بھی حالات دستیاب نہیں لیکن یہ ادیبہ کی حیثیت سے اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے درج ذیل دو مقالے جو ان کی فکری جولانیوں کا مظہر ہیں پہلے مقالے کا عنوان "الصحافۃ اخلاق" ہے۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ خیریہ نے اس میں صحافت کو پیشہ کے بجائے اخلاق قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے زمانے میں تہذیب و تلقین کے وسائل میں تنوع آگیا ہے۔ اب فرائض محض والدین، اہل خاندان، معلمین اور اساتذہ تک محدود نہیں رہ گئے ہیں بلکہ انسانی تہذیب و اصلاح میں عقل و ذہانت اور مقصود و مدعا کے اظہار کے لیے واضح اور منتخب الفاظ کو بھی بڑا دخل ہو گیا ہے جس کے مختلف ذرائع اور متعدد شکلیں ہیں، جن میں سب سے موثر نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے، جو کتاب، رسالہ یا اخبار کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے اہم ذریعہ کو سیئ الاخلاق اور بدکردار لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اخلاقی مفاسد و عیوب کو عوام میں پھیلاتے پھریں۔

وہ اپنے دوسرے مقالہ" الاسلام والمسلمون" میں صحیح اسلامی تعلیم و تربیت پر زور دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ تربیت کی ابتدا بچہ کی غذا کے پہلے لقمہ اور ماں کے دودھ کے

مدرسہ میں تعلیم، معاشرہ سے واقفیت کی پہلی منزل اور سماجی زندگی پہلے قطرے سے ہونی چاہئے۔ مدرسہ میں تعلیم، معاشرہ سے واقفیت کی پہلی منزل اور سماجی زندگی میں سیکھنے کا مرحلہ بعد میں آتا ہے (دیکھئے کتاب من ادب المرأۃ السعودیۃ صفحہ ۱۷۰)

۵۔ ڈاکٹر فاتنہ شاکر: ان سعودی شاعرات و ادیبات کی صف سے تعلق رکھتی ہیں جن کو "الاکادیمیات" کے زمرے میں اہم مرتبہ حاصل ہے "اکادیمیات" کی اصطلاح ان اہل علم و ادب خواتین کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو ملک یا بیرون ملک میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد اکیڈمک زندگی سے وابستہ ہیں۔

فاتنہ شاکر جدہ میں ۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ء) میں پیدا ہوئیں۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کرکے انہوں نے جامعۃ القاہرہ کے کلیۃ التجارۃ سے گریجویشن کیا، ۱۹۶۲ء میں وہ امریکہ گئیں جہاں سوشل اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرکے وطن واپس آئیں اور جدہ میں جامعۃ ملک عبدالعزیز میں تدریسی فرائض انجام دینے لگیں۔ فاتنہ شاکر کا طبعی رجحان نثر کی طرف تھا خصوصاً صحافت اور ادبی نثر سے ان کو زیادہ شغف تھا۔ ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ جدہ ریڈیو سے پہلی نسوانی آواز جس خاتون کی فضا میں بلند ہوئی وہ انہیں کی تھی، ورنہ اس سے قبل کے پروگرام میں خواتین کی آواز شامل نہیں ہوتی تھی۔ ان کا مقبول عام ریڈیو پروگرام "البیت السعودی" جدہ ریڈیو سے نشر ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ ان کی امریکہ روانگی تک کامیابی سے چلا۔ فاتنہ شاکر کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ سنہ ۱۹۸۰ء میں الشرکۃ السعودیۃ للابحاث والتسویق" نے لندن سے عورتوں کا مشہور و مقبول میگزین "سیدتی" جاری کیا تو وہ اس کی پہلی مدیرہ ہوئیں اور ان کی خدمات ایک سال کے لئے جامعۃ ملک عبدالعزیز سے مستعار لی گئیں۔ فاتنہ شاکر کے منتخب مقالات کا مجموعہ "نبت الارض" کے عنوان سے سلسلۃ الکتاب العربی السعودی رقم ۵۳ کے تحت شرکۃ "تہامۃ" جدہ نے



۱۹۸۱ء میں شایع کیا۔ اس مجموعہ کے کئی مقالے بہت خوب ہیں مگر ان میں ایک مقالہ "لا تخافوا علی نسائنا" بڑا چونکا دینے والا ہے۔ اس مقالہ میں وہ اپنی شناخت ایک سعودی عورت کے روپ میں کرانے پر انتہائی فخر اور جوش و خروش کا اظہار کرتی ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ سعودی عورت کی قدامت پسندی اور پسماندگی وغیرہ کا جو عام پروپگنڈا کیا ہے غالباً یہ مقالہ اسی کا اجتماعی ردعمل ہے۔ فخریہ انداز میں ان کا اپنے علی الاعلان سعودی عورت کہنا مخالفین کے لئے تازیانہ ہے۔

"..... اننی اشعر بفخر غیر قلیل بالمرأۃ السعودیۃ واعترافی هذا قد یکون بمثابۃ المفاجاۃ لمن لم یعرفوننی فہم یعرفوننی فی حکمی "القسوۃ" علی المرأۃ السعودیۃ طالبۃ وزمیلۃ، وعلیہا ایضاً کذات ......؟ (نبت الارض۔ مجموعۃ فاتنہ شاکر ص۱)

آگے چل کر وہ اپنی ہم وطن سعودی عورتوں کو اپنے فرائض کی بجاآوری اور دستیاب مواقع سے فائدہ اٹھانے کی پُر زور وکالت کرتی ہیں۔

"بالرغم من احساسی بانہ مازال امام المرأۃ السعودیۃ شوط کبیر لاعتلاء قمۃ الجدیۃ والاحساس بالمسئولیۃ الوطنیۃ سواء کان ذلک فی دورها داخل نطاق اسرتها او خارجه فی نطاق مجتمعها الکبیر......

اسی مقالہ میں وہ سعودی عورت کو مرد کا شکار اور مرد کو بھیڑیا سمجھے جانے والے انداز فکر سے پرہیز پر زور دیتی ہیں۔

ان ما تحتاجہ الیوم المرأۃ السعودیۃ ھو ان نکف عن التعامل معها

کاشئی فقط، کغریۃ مستبعد فقد دائماً من قبل "الرجل الذئب" و

من ثم الاعتقاد بوجوب الحفاظ فی قمقم .... (نبت الارض صفحہ ۱)

ان مقالات سے فاتنہ شاکر کے "تبحر علمی" زندگی کے تجربات اور سعودی خواتین کے لیے

ان کی دردمندی اور تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے، ان پہلوؤں کا اظہار جن پُرجوش الفاظ اور انداز میں

انہوں نے کیا ہے وہ ان کی نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔

۶۔ ڈاکٹر مریم بغدادی: "اکادیمیات" ہی کے زمرے سے تعلق رکھنے والی شاعرہ ڈاکٹر مریم البغدادی بھی بہت مشہور اور نسائی ادب میں بلند رتبہ کی حامل ہیں۔ انہوں نے پیرس کی سوبورن یونیورسٹی سے اعلی تعلیم حاصل کی اور آداب میں تخصص کی ڈگری لی۔ ان کی تالیفات اور مقالات کی تعداد زیادہ ہے۔ شرکۃ "تہامہ" نے "عواطف النسائیۃ" کے عنوان سے ان کا دیوان شائع کیا ہے۔ اس کے تامل، وجدان و موسیقیت سے بھرے ہوئے اشعار ان کی شاعرانہ قدرت و مہارت کی دلیل ہیں انہوں نے اپنے بیٹے کے فراق اور جدائی پر خون دل سے جو اشعار قلم بند کئے ہیں۔ ان میں امید، یاس، درد، مسرت، سعادت اور بدنصیبی کے جذبات کی اچھی ترجمانی ہے۔

سالت علیک یا املی وکان الشوق کاللہب

یحرق جل اس کانی ولا اشکو من النصب

و جرانی الوجد"

(عواطف النسائیہ۔ الکتاب العربی السعودی رقم ۱۵، صفحہ ۱۵)

۷۔ ڈاکٹر امل محمد شطا: کا نام بھی ناول نگاری اور افسانہ نویسی کے میدان میں قابل ذکر ہے۔ موصوفہ ڈاکٹری کے پیشہ سے وابستہ ہونے کے باوجود ادبی سرگرمیوں



کے لئے بھی وقت نکال لیتی ہیں۔ ان کی پیدائش مکۃ المکرمۃ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کی تکمیل قاہرہ یونیورسٹی میں ہوئی۔ انہیں چھپنے چھپانے سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، عرصہ تک ان کے ادبی کمالات لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ ان کا ضخیم سماجی ناول "غدا انسیٰ" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا مرکزی کردار جزائر جاوۃ کی رہنے والی ایک ایسی بدنصیب ماں ہے جس کے سعودی شوہر نے ایک لمبے عرصہ سے اس کو جاوہ میں ہی چھوڑ رکھا ہے مگر اس کی بچی کو اپنے ساتھ ہی مکۃ المکرمہ میں رکھتا ہے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد ایک دن اچانک وہ مکۃ المکرمہ کے اس اسکول میں پہنچ جاتی ہے جہاں اس کی بچی جس کی عمر اب پندرہ برس کے قریب ہے۔ پڑھتی ہے۔ دونوں ایک دوسری کو پندرہ سال میں رونما ہونے والے حوادث وواقعات سے باخبر کرتی ہیں۔

گو دکتورہ آمل محمد شطا کا یہ ضخیم ناول فنی خامیوں کی وجہ سے سخت تنقید کا نشانہ بنا مگر ان کی کوشش کامیاب ہے خصوصاً مکالمات بعض جگہ بہت فطری ہیں اور وہ رقت وشدت تاثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ آمل کا یہ ناول الکتاب العربی السعودی رقم ۸ کے تحت مکتبہ تہامہ جدہ نے ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء میں کافی اہتمام سے شائع کیا ہے۔

اہل مغرب اور نام نہاد جدت پرستوں کی طرف سے اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا دور حاضر کی سعودی عورت نے اجتماعی اور فکری امور میں حصہ لینا شروع کیا؟ کیا اس نے معاشرہ کے فکری، ادبی اور ثقافتی میدان میں اپنے وجود کا احساس دلایا؟

ان سوالات کا منصفانہ اور محتاط جائزہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ جدید مملکت سعودیہ میں تعلیم نسواں کا عمومیت اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اندرون وبیرون ملک آسانیاں اور مواقع کا فراہم ہونا سعودی عورت کے حق میں ایک نعمت ہے۔ اس نعمت سے فائدہ اٹھا کر تعلیم میں

ارتقاء کی منزل طے کرنے کے ساتھ ہی فکری اور ثقافتی میدانوں میں بھی خواتین نے نمایاں پیش رفت کی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ذرائع ابلاغ خصوصاً صحافت اور ریڈیو و ٹیلی ویژن نے بھی خواتین کے فکر و شعور کو بیدار کیا ہے اور ان حقایق و فرائض سے انہیں آگاہ کیا ہے جو معاشرہ اور ملک و وطن کے تعلق سے ان پر عائد ہوتے ہیں خصوصاً اسلامی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر ان کے اندر مغرب کی اندھی تقلید اور جھوٹی نمایش کے خلاف اقدام کی جرأت پیدا ہوئی ہے اور اس سماجی مرتبہ و منزلت کا شدید احساس ان کو ہوا ہے جو دینِ حنیف نے انہیں عطا کیا تھا۔ چنانچہ آج کی سعودی عورت تعلیم، تہذیب، تربیت اور ادب و ثقافت کے میدانوں میں مردوں کی طرح ارتقائی منازل کی طرف گامزن ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سعودی ناقدین اور مورخین ادب نے خواتین کی نگارشات کو نظر انداز کیا ہے یا کماحقہ ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے۔

لیکن شیخ عبد الکریم بن صمد بن ابراہیم العقیل کی تالیف: "من ادب المراۃ السعودیۃ المعاصرۃ" نے اس کمی کی یک گونہ تلافی کی ہے" جیل الخمسینات" کے بعد سے آج تک جن خواتین نے علم و ادب میں حصہ لیا ہے یا جنھوں نے پیش قدمی کی ہے ان کے بارے میں مختصراً اس کتاب سے واقفیت ہوجاتی ہے۔ اس میں ان نثری نگارشات کو جمع کیا گیا ہے جو مقالوں اور انشائیوں کی صورت میں عربی اخبار و رسائل میں پہلے شایع ہوچکے ہیں۔ بلاشبہ یہ شیخ عبد الکریم العقیل کا قابلِ تعریف کام ہے اگر اس میں مقالہ نگار خواتین کے حالات بھی درج کردیے گئے ہوتے تو یہ کتاب سعودی نسائی ادب کے لئے ایک اہم دستاویز بن جاتی۔ یہ ایک سو تین (۱۰۳) مقالہ نگار خواتین کی ایک سو اکہتر (۱۷۱) نگارشات پر مشتمل ہے جن خواتین کا ذکر اس مجموعہ میں ہے ان میں اکثر نسبتاً کم معروف ہیں مگر ان کی تحریروں کا تحقیقی و فکری



انداز ان کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے۔

## مراجع

۱ دیوان۔ آماس واطلاس۔ للعواد صفحہ ۳، مطابع دار الثقافہ ۱۹۵۲ء بیروت ۲ الموجز فی تاریخ الادب العربی السعودی عمر الطیب الساسی صفحہ ۲۰۵ "تہامہ" جدہ ۱۴۰۶ھ ۳ الموسوعۃ الادبیۃ عبد السلام طاہر الساسی دار قریش مکہ ۱۳۸۸ھ ۴ من ادب المراۃ السعودیۃ المعاصرۃ عبد الکریم بن ابراہیم العقیل صفحہ ۸۴ المطابع النموذجیۃ الریاض ۱۴۰۳ھ ۵ جریدہ الندوہ رقم العدد ۸۸۰۷، میونسپل سینٹرل لائبریری جرائد سیکشن العلیا الریاض ۶ بنت الارض مجموعہ مقالات فاتنہ شاکر سلسلۃ الکتاب العربی السعودی ۳۵ تہامہ جدہ ۱۴۰۱ھ ۷ عواطف النسائیۃ شعری مجموعہ مریم البغدادی " " ۱۵ تہامہ جدہ ۱۴۰۱ھ ۸ غداً انسی ناول آمل محمد شطا سلسلۃ الکتاب العربی السعودی ۲۸ تہامہ جدہ ۱۴۰۱ھ ۹ الحرکۃ الادبیۃ فی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ ڈاکٹر بکری شیخ امین دار العلم للملایین بیروت ۱۹۸۶ء ۱۰ النثر الادبی فی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔ عبد الرحمن الشامخ، مطابع نجد التجاریۃ الریاض ۱۳۹۵ھ ۱۱ اتجاہات الشعر المعاصر فی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔ ڈاکٹر عبد اللہ العلی الحامد موسسۃ الجزیرہ الریاض ۱۴۰۵ھ ۱۲ التعلیم فی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔ عبد الوہاب احمد عبد الواسع دار الکاتب العربی بیروت ۱۹۶۹ء ۱۳ فصول حول الادب فی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ عبد اللہ العلی الحامد موسسۃ الجزیرۃ الریاض ۱۴۰۵ھ ۱۴ فی الشعر المعاصر فی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ عبد اللہ العلی الحامد مطابع حنیفیۃ الریاض ۱۴۰۲ھ ۱۵ اتجاہات الشعر المعاصر عبد اللہ العلی الحامد موسسۃ الجزیرۃ الریاض ۱۴۰۵ھ۔

# لفظ "زندیق" کی لغوی تحقیق

از ڈاکٹر مقصود احمد*

عربی زبان وادب میں زندیق کا استعمال بقول ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵ - ۱۹۷۲ء) ظہور اسلام کے بعد ملتا ہے، البتہ ایرانی زبان میں یہ بہت پہلے سے موجود تھا[1] عالم عرب میں اس کا ورود سب سے پہلے ۷۴۲ء میں عراق میں ہوا[2] عربی میں اس کی مختلف شکلیں مستعمل ہیں۔ "زِندیق" بروزنِ فِعلیل اور "زَندَقی" زِندِقی یا زندقی"۔

اس کی اصل اور معنی کے متعلق عربی و فارسی کے فضلاء اور لغت نویسوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) سارے عربی ماخذ بالاتفاق اسے فارسی الاصل قرار دیتے ہیں اور زندہ کردیا زندہ کر یا زیندہ کا معرب مانتے ہیں۔ اس لئے کہ "زندیق" عموماً اس شخص کو کہتے تھے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ دنیا ازل سے قائم ہے اور یوں ہی رہے گی[3]۔

(۲) یہ زندہ گر (متبع و متمسکِ "زند" - اوستا کی پہلوی تفسیر) سے مشتق ہے[4]۔

(۳) متاخرین کی تالیف کردہ بعض عربی کتابیں اور فارسی فرہنگیں زندیق کی فارسی اصل "زندی" (عالم زند) بتاتے ہیں جو اشتقاق کے لحاظ سے درمیانی دور کی فارسی میں "زندیک" تھا[5]۔

* شعبۂ عربی، بڑودہ یونیورسٹی۔



(۴) یہ زن دین (دینِ زن) سے مشتق ہے[6] مگر یہ خیال عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس سے کسی سنجیدہ مفہوم کی نشاندہی نہیں ہوتی اور نہ کسی مذہبِ زن کا کوئی تاریخی ثبوت ملتا ہے۔

(۵) بعض فضلاء نے یہ بھی کہا ہے کہ "زندقی" اس شخص کو کہتے ہیں جو نہایت دور اندیش اور معاملہ فہم ہو۔ چنانچہ ابن دُرید نے جب اس کے متعلق اپنے استاد الریاشی (متوفی ۲۵۷ھ) سے پوچھا تو اس نے کہا:

یُقَالُ رَجُلٌ زَنْدَقِیٌّ إِذَا کَانَ نَظَّارًا فِی الْأُمُوْرِ[7]

(۶) زندقی بخیل اور اپنی جان پر تنگی کرنے والے کے مفہوم میں بھی آتا ہے[8]۔

(۷) VOLLERS کے مطابق زندیق یونانی الاصل ہے، جو یونانی لفظ "YVW-ARIXOC" سے مشتق ہے[9]۔

(۸) بقول BEVAN اس کی اصل آرامی ہے۔ یہ آرامی لفظ زدیقا (= عربی صدیق) سے ماخوذ ہے اور اس کی مشدد "د" میں سے پہلی "د" نے "ن" کی آواز اختیار کرلی۔ اس طرح "زندیک" وجود میں آیا۔ جیسے سنسکرت "سدھانت" عربی میں "سندہند" ہوگیا وہی صورت زدیقا (زندیک) کی ہے[10]۔

ابن الندیم (م ۳۸۵ھ) اور عربی مصنفوں نے امتِ مانی کے طبقہ خواص[11] کے ارکان کے لئے "صدیق" (جمع صدیقون) کا لفظ استعمال کیا ہے جو مانویوں کی پہلوی اصطلاح "وزیدگ" (بمعنی برگزیدہ) کا عربی ترجمہ ہے اور اس کو اصل کی حیثیت قطعاً حاصل نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود پروفیسر بیون اسی "صدیق" کے آرامی عدیل "زدیق" (زدیقا[12]) کو فارسی لفظ "زندیک" کی اصل قرار دیتے ہیں، جو درست نہیں ہے۔

مندرجۂ بالا آرا کے تجزیے سے "زندیق" کی اصل سے متعلق تین[30] نظریے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ لفظ یونانی الاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ آرامی الاصل ہے اور تیسرے یہ کہ یہ فارسی الاصل ہے۔ متعدد زبانوں کے عالم اور محقق بے بدل ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی) پہلے اور دوسرے خیال کو مسترد کرتے ہیں اور تیسرے خیال کو درست قرار دیتے ہیں۔ موصوف محترم "زندیق" کے اشتقاق سے متعلق اپنے موقف اور نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے یوں ارقام فرماتے ہیں:

"لغوی اشتقاق کی رو سے "زندیک" بلاشبہ اوستا کی زبان کے مادے "زن" (بمعنی دانستن) سے مشتق ہے۔ اسی بنا پر اوستا: "زاناد" اور "زانام" جنوب مغرب کی زبان (فارسی) میں بالترتیب "داند" اور "دانم" ہیں ... جن میں قدیم "ز" فارسی میں "د" ہوگئی ہے۔ درمیانی دور کی فارسی کا لفظ "زندیک" ایران کے شمال کی زبان سے آیا مگر اس میں صوتی تبدیلی نہیں ہوئی۔"[31]

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے بموجب اس لفظ کا استعمال شروع میں "زند" کے عالم کے لئے ہوا جو درمیانی دور کی فارسی (پہلوی) میں "زندیک" کے لقب سے پکارے گئے مگر بعد میں اس کے مفہوم میں تبدیلی واقع ہوئی اور یہ "زند" کی شکل میں بے دینوں یا بد دینوں کے ناموں کے ساتھ آنے لگا۔ لفظ "زندیک" عربی میں آکر "زندیق" ہوگیا۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے م۔ ص، ص ص ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۳)۔

بقول ڈاکٹر صدیقی یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب عربی میں "ق" اور "ک" دونوں موجود تھے تو فارسی "ک" کی جگہ عربی "ک" نے کیوں نہ لی اور بجائے اس کے عربی "ق" فارسی "ک" کی نمایندگی کس بنا پر کرنے لگا؟ اس سوال کا جواب ڈاکٹر صاحب ہی کے



الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

"... عربی (یا کسی اور سامی زبان) میں جاکر صرف فارسی ہی کا "ک" بدل کر "ق" نہیں ہوا بلکہ فارسی کے علاوہ یونانی، سنسکرت وغیرہ سے جو لفظ عربی میں آئے ان میں بھی اگر "ک" تھا تو وہ عربی میں "ق" ہوگیا ہے، مثلاً یونانی "کلیدؔ" (ے مجہول) فارسی میں آکر "کلید" لیکن عربی میں "اقلید" ہوا اور بعض اور سامی زبانوں میں "اقلیدا" اور "قلیدا" ہوا ... یونانی (کندے لا) اور آرامی "قندیلا" عربی میں "قندیل" ہے۔ یونانی "بے ری کو کسکا" عربی میں "برقوق" (مشمش) آرامی "برقوقا" سے حاصل ہوا ... عربوں نے ایسے لفظوں کو آرامیوں اور عبرانیوں سے جیسے سنا تھا اسی طرح ("ق" سے) بولنا اختیار کیا" (م۔ ص، ص ص ۱۶۳، ۱۶۴)

اپنے قول کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فاضل محقق فرماتے ہیں:

"سامی زبانوں (آرامی، عبرانی، عربی وغیرہ)[32] کے بولنے والے اپنے "ک" کو ایک نہایت خفیف نفخ کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور غیر سامی زبانوں (یونانی، سنسکرت، فارسی وغیرہ)[33] کے خالص "ک" کو سن کر اسے اپنے "ک" سے کسی قدر مختلف پاتے ہیں اسی احساس کے ساتھ جب انہوں نے غیر سامی "ک" کو ٹھیک ادا کرنے کی کوشش کی تو نتیجہ اس کا "ق" ہوا۔" (م۔ ص، ص ۱۶۵)۔

یہاں ایک اور سوال اٹھتا ہے، وہ یہ کہ "زَندیک" کی مفتوح "زَ"، "زِندیق" میں مکسور کیوں کر ہوگئی ہے اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ چوں کہ عربی میں وزن "فِعلیل" پہلے سے موجود تھا اور عرب اس سے خاصے مانوس تھے لہذا انہوں نے تلفظ میں سہولت کے پیش نظر "زندیک (ق)" کے بجائے "زِندیق" کہنا زیادہ پسند کیا۔ یہ ایک عام قاعدہ

ہے کہ جب کسی زبان کے بولنے والے دوسری زبان سے کوئی لفظ مستعار لیتے ہیں تو عموماً وہ اس کا تلفظ اپنی زبان میں پہلے سے موجود اس سے قریبی مماثلت رکھنے والے وزن یا لفظ کے مطابق کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور امر کی نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے یعنی یہ کہ فارسی زبان کے قاعدے کے مطابق اگر کسی لفظ کے آخر میں پرانی فارسی زبان میں "ک" تھا اور اس کا ماقبل حرفِ علت (ا، و، یا ی) تھا تو وہ بعد کی فارسی میں گر گیا۔ جیسے "اژدہاک" حذف "ک" کے بعد "اژدہا" ہوگیا۔ اسی قاعدے کے تحت "زندیک" کا "ک" حذف ہوگیا تو "زندی" رہ گیا۔ مزید برآں اس کی پرانی شکل "زندیک" بھی موجودہ زمانے کی بعض فرہنگوں میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فارسی میں اس لفظ کی دو صورتیں پائی جاتی ہیں۔ زندیک اور زندی۔ جن لوگوں نے "زندیق" کو "زندی" سے مشتق قرار دیا ہے ان کے پیشِ نظر یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ اصلاً اس کے آخر میں "ک" تھا جو مرورِ زمانہ کے ساتھ محذوف ہوگیا۔ اس لئے ان کی رائے کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہونی چاہئے۔ لفظ "زندیک" کے علاوہ فارسی کے بعض اور اسم بھی ہیں جن کی دو شکلیں مستعمل ہیں جیسے آستین اور آستی (بعد حذف نون)، زمین اور زمی (بعد حذف نون) وغیرہ۔ اسی قیاس پر لوگ عربی لفظ "کمین" کو "کمی" بھی بولنے لگے۔ چنانچہ اسدی نے اپنی فرہنگ "لغت فرس" میں لکھا ہے: کمی کمین باشد۔ خسروی گفت:

اے سراپائے معدنِ خرّمی     چشم تو بردلم نہاذہ کمی

(خُرمی کی جگہ خُرّمی ہونا چاہئے۔ نہاذہ، نہادہ کی پرانی شکل ہے)۔ (مزید معلومات کے لئے دیکھئے مقالاتِ صدیقی، ص ص ۱۲۱، ۲، ۱۶۶، ۲۰۰، نیز A COMPREHEN-SIVE



PERSION-ENGLISH DICTIONARY: F. STEINGHASS، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۶۲۶)۔

ڈاکٹر صدیقی صاحب کی فاضلانہ لغوی تحقیق اور ان کے پیش کردہ براہین و شواہد کی روشنی میں "زندیق" کو فارسی الاصل قرار دینا ہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیوں کہ لغت کی رو سے اس میں اور صدیق یا زندیق میں کسی قسم کا کوئی تعلق ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں تاریخ بھی کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فارسی میں (بہ شکل زند) بے دین یا بددین کے معنی میں اوستائی زمانے کے آخری دور سے موجود چلا آرہا ہے۔ (دیکھئے م۔ ص، ص ۱۷۱)

جہاں تک اس کے لغوی معنی کا سوال ہے شروع میں یہ عالم زند اور متبع زند کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ بعد میں اس کے مفہوم میں تبدیلی واقع ہوئی اور اس کا اطلاق بے دین، بددین، ملحد اور دہری وغیرہ پر ہونے لگا۔ ہاں اس کی دوسری شکل "زندق" البتہ دور اندیش اور معاملہ فہم نیز بخیل اور اپنی جان پر تنگی کرنے والے کے مفہوم میں آتی ہے۔

**اصطلاحی معنی**

"زندیق" کی اصل اور لغوی معنی کی تشریح کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصطلاحی معنی کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ اس کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے۔

(۱) مجوسی یا آتش پرست [۱۶]

(۲) دو خداؤں کو ماننے والا [۱۷]

(۳) مانی اور مزدک کا اتباع کرنے والا [۱۸]

(۴) دینِ حق سے انحراف کرنے والا۔[۱۹]

(۵) بدعت کا ارتکاب کرنے والا۔[۲۰]

(۶) دینی امور میں شکوک و شبہات کا اظہار کرنے والا۔[۲۱]

(۷) عالمِ آخرت اور وحدانیت کا انکار کرنے والا۔[۲۲]

(۸) کافر، منافق، ملحد، دہری اور مادہ پرست۔[۲۳]

لغوی اور اصطلاحی معنی کے جائزے کے ساتھ ساتھ اس کے اطلاق پر بھی روشنی ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس سے بخوبی یہ معلوم ہوجائے گا کہ اس کا استعمال کس قسم کے لوگوں اور کن فرقوں کے لئے ہوا ہے۔

(۱) اولاً اس کا اطلاق زند کے عالم اور اس کے اتباع کرنے والوں پر ہوا۔

(۲) درمیانی زمانے کی فارسی (پہلوی) میں نیز جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس سے پہلے اوستائی زمانے کے آخری دور میں یہ لفظ ("زند" کی شکل میں) بے دینوں یا بددینوں کے ناموں میں ملتا ہے۔ (دیکھئے م۔ ص، ص ۱۷۱)

(۳) عربی کے نامور مورخ احمد بن ابی یعقوب (صاحبِ تاریخ الیعقوبی) اور دیگر مصنفوں نے اس کا استعمال مانوی مذہب کے بانی "مانی" کے نام کے ساتھ کیا ہے۔ (ایضاً)

(۴) اس کا اطلاق زرتشتیوں، مانویوں، مزدکیوں اور آزاد خیال لوگوں کے ساتھ ساتھ بدعت والوں اور عیسائیوں پر بھی ہوا ہے۔ (ایضاً، ص ص ۱۷۰، ۱۷۳)۔

(۵) مسلمانوں نے اسے ہر اس شخص کے لئے استعمال کیا جس کا کوئی عقیدہ ان کے عقیدے کے خلاف ہو۔ یہاں تک کہ خود اسلام کے بعض فرقے "زندیق" کے لقب سے پکارے گئے۔ معتزلیوں کو اکثر صحیح المذہب مسلمانوں نے "زَنَادِقَۃُ الاِسلام" کے



نام سے یاد کیا ہے۔[۲۴]

(۶) بعض صوفیہ حضرات مثلاً حضرت ذوالنون مصری (م ۸۶۰ء)، شیخ ابوالحسین نوری (م ۹۰۷/۸ء)، حسین بن منصور حلاج (م ۹۲۲ء) وغیرہ کو بھی "زندیق" کے لقب سے نوازا گیا ہے۔[۲۵] ان پر یہ نوازش غالباً ان کی شطحیات کی بنا پر کی گئی۔

## لفظ "زندیق" کی مختصر تاریخ

اس تفصیل سے لفظ "زندیق" کا صحیح مفہوم اور اس کا پس منظر واضح ہوگیا ہوگا۔ تاہم آخر میں بطور خلاصہ اس کی مختصر تاریخ[۲۶] درج کی جاتی ہے تاکہ پروفیسر بیون کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کا ازالہ ہوسکے کہ اس کا اطلاق سب سے پہلے مانوی مذہب کے طبقۂ خاص کے ارکان پر کیا گیا جو "صدیق" کے نام سے جانے جاتے تھے اور یہ بخوبی ثابت ہوجائے کہ یہ لفظ ایران کی زبان میں مانی کے اس جہانِ فانی میں تشریف لانے سے کہیں پہلے سے موجود تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ابتداءً اس کا اطلاق "زند" (تفسیر اوستا) کے عالم اور اس کے متبعین پر کیا گیا۔ پھر اوستائی زمانے کے آخری دور میں یہ لفظ "زند" کی شکل میں بے دین یا بددین وغیرہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ درمیانی زمانے کی فارسی (پہلوی) میں بھی اس کا استعمال اسی معنی میں کیا گیا۔ جب مسلمان ایران پہنچے تو انہوں نے زرتشتی اور مانوی دونوں مذہبوں کے اصول و عقائد کو اسلام کے اہم اصول سے متناقض پاکر انہیں پسند نہ کیا اور ان کے ماننے والے کو "زندیق" یعنی بے دین، ملحد اور دہری کہنے لگے۔ تیسری صدی ہجری کے عربی کے نامور مورخ احمد بن ابی یعقوب (صاحبِ تاریخ الیعقوبی) و دیگر عربی مصنفوں نے تو اس کا اطلاق خود "مانی" پر بھی کیا ہے۔ عربی میں شروع میں تو یہ زرتشتیوں، مانی اور اس کے ماننے والوں کے لئے ہی استعمال

کیا گیا مگر بعد میں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کا اطلاق مزدکیوں، بدعت والوں، عیسائیوں اور آزاد خیال لوگوں بلکہ خود اسلام کے بعض فرقوں اور شخصیات کے ناموں کے ساتھ بھی ہونے لگا۔

پہلے گزر چکا ہے کہ لفظ "زندیق" سب سے پہلے عراق میں ظہور پذیر ہوا اور اس کا اطلاق ۷۴۲ء میں سب سے پہلے جعد بن درہم پر کیا گیا۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ اس کا تعارف پوری عرب دنیا میں اس طرح ہوا کہ یہ عربی زبان و ادب کا ایک اہم جزء بن گیا۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اسے ہر اس شخص اور ہر اس فرقے کے لئے استعمال کیا جو کوئی عقیدہ جمہور مسلمانوں کے کسی عقیدے کے خلاف رکھتا تھا۔ چنانچہ معتزلیوں کو صحیح المذہب مسلمانوں نے "زنادقۃ الاسلام" سے موسوم کیا۔ اپنے مخصوص خیالات و عقائد کی بناء پر عربی کے مشہور شاعر بشار بن برد (م ۷۸۳ء) اور صالح بن عبد القدوس (م ۷۸۳ء) بھی "زندیق" قرار دئے گئے۔ ابن الراوندی، التوحیدی اور ابو العلا المعری (۹۷۳ - ۱۰۵۷ء) پر بھی اس کی زد پڑی اور یہ تینوں "زنادقۂ ثلاثہ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ سلسلہ ان دنیاداروں پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ یاروں نے حضرت ذو النون مصری، شیخ ابو الحسین نوری اور حسین بن منصور حلاج جیسے صوفیہ کو بھی "زندیق" گردانے میں پس و پیش نہیں کیا۔ علاوہ ازیں موجودہ صدی کے عربی کے نامور ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین (۱۸۸۹ - ۱۹۷۳ء) کو بھی "زندیق" کے حلقہ بگوشوں میں شامل کر لیا گیا ہے۔

## حواشی و مآخذ

۱؎ دیکھئے عبد الستار صدیقی: مقالات صدیقی (حصہ اول) مرتبہ مسلم صدیقی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ص ۱۶۹، ۱۷۰؛ نیز ملاحظہ کیجئے: SHORTER ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM:



H. A. R. Gibbond. J.H.Kramers , Lieden ۱۹۵۳ء، ص ۶۵۹۔

(۳) ملاحظہ ہو مقالاتِ صدیقی، ص ۱۶۹ نیز ابن منظور: لسان العرب، جلد دہم، قم (ایران) ۱۴۰۵ھ، ص ۱۴۷

(۴) دیکھئے An Arabic - English Lexicon : Edward William Lane، جلد سوم، دہلی ۱۹۸۵ء ص ۱۲۵۸ نیز A Literary History of Persia : E.G. Browne، جلد اول، Cambridge ۱۹۵۱ء، ص ۱۵۹

(۵) دیکھئے مقالات صدیقی، ص ۱۷۰

(۶) ملاحظہ کیجئے An Arabic - English Lexicon، جلد سوم، ص ۱۲۵۸۔ ترکیب "دینِ زن" اضافت مقلوب کے سبب "زن دین" ہو گئی۔

(۷) بحوالہ مقالاتِ صدیقی، حصہ اول، ص ص ۱۶۹، ۱۷۰۔

(۸) ملاحظہ ہو لسان العرب، جلد دہم، ص ۱۴۷ : An Arabic - English Lexicon جلد سوم، ص ۱۲۵۸ اور المنجد (عربی - اردو)، دیوبند (انڈیا) ب - ت، ص ۳۴۳

(۹) دیکھئے Shorter Encyclopaedia of Islam، ص ۶۵۹۔

(۱۰) ملاحظہ کیجئے A Literary History of Persia جلد اول، ص ۱۶۰ : A Literary History of the Arabs, Cambridge ۱۹۶۹ء ص ۳۷۵ اور مقالات صدیقی، ص ص ۱۶۹، ۱۷۰۔

ڈاکٹر عبد الستار صدیقی کے نزدیک یہ نظیر دعوے کے ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ ان کے بقول نہایت قرینِ قیاس یہ ہے کہ "سندہند" کا پہلا "ن" لفظ "سدھانت" کے "ن" کے اثر سے پیدا ہو گیا ہے اور بس۔ (م۔ص، ص ۱۷۲)

اس سوال کے جواب میں کہ "ق" کی جگہ "ک" کیوں ہو گیا ہے پروفیسر بیون کا غالباً یہ فرمانا ہے کہ چوں کہ قدیم فارسی اور درمیانی دور کی فارسی (پہلوی، زند، پازند وغیرہ) میں سامی یا آرامی "ق" کی آواز نہیں پائی جاتی اس لئے اس کا تلفظ "ک" سے کیا گیا۔

(۱۱) مانی کی امت کی تنظیم ابتدا ہی سے دو (خاص) طبقوں میں بانٹ دی گئی تھی: ایک عوام کا، دوسرا خواص المسترشدین کا۔ عوام کے لئے حضرت موسیٰ کے دس احکام کی طرح مانی کے بھی دس حکم تھے۔ عوام کا کام یہ تھا کہ ان کو سنیں اور ان پر عمل کریں۔ اسی لئے اس طبقے کا نام سماعون (سننے والے) رکھا گیا۔ خواص کا انتخاب بہت سختی اور بڑی احتیاط سے ہوتا اور وہی قبول کئے جاتے تھے، جو سخت سے سخت آزمائش میں پورے اترتے تھے۔ ان کے لئے علاوہ احکامِ عشرہ کے چند اور حکم بھی تھے۔ یہ طبقہ مجتبین یعنی چیدہ لوگوں کا تھا اور اس طبقے کے ارکان "صدیق" کہلاتے تھے۔ (صدیقون جمع) اور صدیقوت سے مراد ان کی پوری جماعت تھی۔۔۔۔
ابن ندیم نے "صدیقون" کے لئے "المجتبین" (یعنی برگزیدہ) کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ ابن ندیم اور عربی مصنفوں نے جو "مجتبیٰ" اور "سماع" کے لفظ استعمال کئے ہیں وہ مانیوں کی اصل (پہلوی) اصطلاحوں "وزیدک" (یعنی برگزیدہ) اور "شنفتک" (جمع، وزیدگان اور شنفتگان) کا عربی ترجمہ ہیں۔ (دیکھئے مقالات صدیقی، ص ص ۱۶۱، ۱۶۲ A history of Persia جلد اول، ص ص ۱۵۹، ۱۶۰ اور ابن ندیم: کتاب الفہرست، تہران، ۱۹۷۱، ص ص ۳۹۶، ۳۹۸، ۳۹۹)

"ایران بعہد ساسانیان" میں امت مانی کے پانچ طبقے بتائے گئے ہیں، یعنی تین اور بھی ہیں: (۱) فریستگان (ایلچی) جو صرف ۱۲ شخص تھے (۲) اسپستگان (قسیس) ۷۲، (۳) مہشتگان (بزرگان) جن کی تعداد محدود نہ تھی۔ (ایران بعہد ساسانیان۔ مترجم: پروفیسر محمد اقبال) انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء ص ۲۵۲، بحوالہ مقالات صدیقی، ص ۱۶۲۔

(۱۲) "زندیقا" کے آخر میں جو الف آیا ہے، وہ اداۃ التعریف ہے، عربی میں اداۃ التعریف (ال) اسم کے شروع میں آتا ہے لیکن آرامی (سریانی) میں اسم کے آخر میں۔ (دیکھئے مقالات صدیقی، ص ۱۶۲) (۱۳) مقالات صدیقی، ص ۱۶۳ (۱۴) داوین کے الفاظ راقم کے اضافہ کردہ ہیں (۱۵) ایضاً (۱۶) دیکھئے



An Arabic-English Lexicon Vol-III ص ۱۲۵۸، (۱۷) ایضاً (۱۸) دیکھئے نفسِ مصدر اور Arabic-English Dictionary : F.Steingass دہلی، ۱۹۷۸ء ص ۳۶۵ (۱۹) ملاحظہ ہو نفسِ مصدر اور مقالات صدیقی، ص ص ۱۶۱، ۱۶۳ (۲۰) دیکھئے A Literary History of the Arabs ص ۳۷۲ (۲۱) ملاحظہ کیجئے An Arabic - English Lexicon Vol-III ص ۱۲۵۸ (۲۲) ملاحظہ ہو نفس مصدر نیز لسان العرب، جلد دہم ص ۱۳۷ (۲۳) دیکھئے لسان العرب، جلد دہم، ص ۱۳۷۔ Arabic-English Dictionary: Steingass ص ۳۶۵، نیز مقالاتِ صدیقی، ص ۱۶۰ (۲۴) دیکھئے مقالات صدیقی، ص ص ۱۶۰، ۱۶۱ نیز A Literary History of the Arabs ص ۳۷۲ (۲۵) ملاحظہ ہو Shorter Encyclopaedia of Islam ص ص ۶۵۹، ۶۶۰ اور A Literary History of the Arabs ص ۳۸۷ (۲۶) یہ مختصر تاریخ درج ذیل کتب کی مدد سے مرتب کی گئی ہے: مقالات صدیقی (حصہ اول) ص ص ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳، A Literary History of the Arabs ص ص ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۸۷، ۳۹۲، Shorter Encyclopaedia of Islam ص ص ۶۵۹، ۶۶۰، نیز Dictionary of Islam : Thomas Patrick Hughes دہلی (لفظ "Zindiq")

---

معارف کی ڈاک،
لوکو کالونی - علی گڑھ
۲۹ / ۷ / ۱۹۹۹ء

## علم کی تجسیم

محترم و معظم زید فضلکم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ شمارے ( جولائی ) میں ص ۲، پر ڈاکٹر ابرار صاحب کا قطعہ " علم کی تجسیم " چھپا ہے اس میں علم کی تجسیم سے مراد انہوں نے غالباً " مجسم علم " لیا ہے یہ اردو کے استعمال کے خلاف ہے ۔ اردو میں مصدر اسم فاعل یا مفعول کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوتا ۔ دوسری خامی یہ ہے کہ تیسرے مصرعے میں بالکل بچکانہ اور جاہلانہ طور پر عربی کے واو عطف کا استعمال " بھی " کے بعد کیا گیا ہے ۔

رئیس احمد نعمانی

## معارف کا اشتیاق

حضرو - اٹک
۸ / اگست ۹۹ء    مخدوم الکرم    سلام مسنون

مزاج گرامی !

میرے ہوش سنبھالنے پر " معارف " اور علامہ سید سلیمان ندوی ؒ سے کانوں کو آشنائی ہوگئی تھی ۔ کیوں کہ میرے والد گرامی خواجہ محمد خان اسد کو اپنے استاد گرامی علامہ ندوی ؒ سے والہانہ عشق تھا ۔ " دارالمصنفین " سے واپسی پر والد گرامی نے حضرت علامہ ؒ ہی کے حکم پر ان کی آبائی لائبریری دیسنہ کی طرز پر یہاں حضرو ( ضلع اٹک ) میں خالصتاً اردو کی لائبریری قائم کی ۔ جسے دیکھنے حضرت علامہ بہ نفس نفیس حضرو تشریف لائے



بعد ازاں لائبریری کا نام مولانا غلام رسول مہر ؒ نے " میرا کتب خانہ " تجویز کیا ۔ والد گرامی کو اپنے استاد محترم ظفر الملت مولانا ظفر علی خاں ؒ سے بھی بے پناہ عقیدت تھی ۔ اپنے ذوق و شوق کی بدولت مشاہیرِ عصر سے ان کے گہرے روابط تھے ۔ والدِ گرامی نے جب " رقعات عالم گیری " پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے خصوصی تعاون کا یقین دلایا اور اس کا ثبوت شاہ صاحب کے وہ خطوط ہیں جو والد گرامی کے نام میرے پاس محفوظ ہیں ۔ اسی طرح شاہ صاحب کی رحلت کے بعد بھی والدِ گرامی کا " دارالمصنفین " سے علمی و قلبی رابطہ رہا ۔ جس کا اندازہ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن کے کئی صفحات پر مشتمل عنایت نامے سے بخوبی ہوتا ہے ۔ جناب کا بھی ایک مفصل مکتوب گرامی ۱۹ / اگست ۱۹۶۴ء کا والد گرامی کے نام لائبریری میں موجود ہے ۔

والدِ محترم تمام عمر " معارف " کے فائل مکمل کرنے کے لئے کوشاں رہے ۔ اس ضمن میں مقامی طور پر سخی احمد صاحب سے بھی ان کی مسلسل مکاتبت رہتی ۔ انہی کوششوں کی بدولت انہوں نے " معارف " کی ابتدائی چند جلدوں کے علاوہ ۴۴ء سے قریباً ۷۴ء تک کے تمام فائل مکمل کرلئے تھے ۔ مگر ۱۹۸۰ء میں بدوران حج اپنی خواہش و پیشین گوئی کے مطابق حج سے چند روز پہلے خالقِ حقیقی کا بلاوا آگیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت المعلی میں اپنا ٹھکانہ کرلیا ۔ میں چونکہ اس وقت کم سن تھا اس لئے زیادہ توجہ نہ دے سکا ۔ گو کہ لائبریری کو میں نے دست برد زمانہ سے بچائے رکھا اور آج تک اس میں مسلسل اضافہ ہی کرتا جارہا ہوں اور اسوقت پاک و ہند کے نامور مصنفین کی اکثر تصانیف اور کئی معروف رسائل اعزازی و قیمتاً لائبریری کے لئے آرہے ہیں جس سے اسکالرز استفادہ کرتے رہتے ہیں مگر صد افسوس کہ میں " معارف " سے رابطہ قائم نہ

رکھ سکا اور اس کمی سے دل میں ہمیشہ اک کسک سی رہی۔ اسی لئے پچھلے چند سالوں سے "معارف" کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کردیئے۔ غالباً دو سال قبل جناب حافظ محمد یحییٰ صاحب کو سالانہ چندہ بھی ارسال کردیا تھا۔ مگر متعدد یاد دہانیوں کے باوجود آج تک ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ کئی بار آپ کو عریضہ ارسال کرنا چاہا مگر "دارالمصنفین" سے جو عقیدت میری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اس احترام کی بدولت قلم تھامنے کی جرأت ہی نہ ہوسکی۔ مگر آج ہمت کرکے آپ سے مکاتبت کا شرف حاصل کرنے کی سعی تو کرہی ڈالی۔ اب دیکھئے آپ ..........؟

آپ کی تازہ تصنیف "مولانا ابوالکلام آزاد" کا بھی بے حد اشتیاق ہے۔ آپ کا عنایت نامہ آنے پر والد گرامی سے متعلق اپنی مرتبہ "خواجہ محمد خاں اسد" ۔ احوال و آثار" پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ بہر حال سر دست تو مطلوب و مقصود "معارف" ہے اس لئے جس طرح بھی ہوسکے مجھے "معارف" کا مستقل قاری بنالیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ کیا پچھلے فائل بھی دستیاب ہوسکتے ہیں؟ آپ کے عنایت نامے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

والسلام

طالب دعا، راشد علی زئی

---





# وفیات

## شیخ محمد مجذوب

یہ خبر سن کر بڑا ملال ہوا کہ عالم عرب کے ایک فاضل اور اچھے اہل قلم استاد شیخ محمد مجذوب جون ۹۹ء میں وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ شام کے رہنے والے تھے۔ مگر ان کی زندگی کا زیادہ حصہ دوسری جگہوں میں بسر ہوا، عرصہ تک جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہے۔ سبکدوش ہونے کے بعد بھی مدینہ منورہ کے انوار و برکات سے متمتع ہونے کے لئے انہوں نے یہیں قیام پذیر رہنا پسند کیا۔

مجذوب صاحب کی پوری زندگی علم و دین کی خدمت و اشاعت میں گزری، تصنیف و تالیف کا شغل مدة العمر جاری رہا، ہندوستان کا سفر بھی کیا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی دعوت پر ۱۹۸۱ء میں دارالعلوم ندوة العلماء کے طلبہ کے سامنے علمی، دینی اور دعوتی موضوعات پر کئی لکچر دیئے۔ دارالمصنفین کی عظمت و شہرت سے واقف تھے اس لئے زحمت سفر برداشت کرکے مولانا سعید الرحمن الاعظمی اڈیٹر **البعث الاسلامی** کے ہم راہ اعظم گڑھ بھی تشریف لائے اور دو روز قیام کیا۔ کتب خانہ اور دارالمصنفین کے دوسرے شعبے دیکھ کر خوش ہوئے۔

آرام و تفریح کے خیال سے موسم گرما میں شام کے شہر لاذقیہ گئے ہوئے تھے کہ داعی اجل کا پیام آگیا والبقاء للہ وحدہ۔ عمر ۹۰ سال رہی ہوگی۔ اللہ تعالی علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے۔ آمین!!

## مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

اگست کے آخری عشرہ میں پاکستان سے یہ اندوہ ناک خبر آئی کہ مولانا محمد عبدالرشید نعمانی جے پوری کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا کی نظر دینی علوم تفسیر، حدیث اور رجال پر اچھی اور گہری تھی۔ ان کی تعلیمی زندگی کا کچھ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں بھی بسر ہوا۔ ملک کی تقسیم سے پہلے اور بعد میں بھی ان کا تعلق ندوۃ المصنفین دہلی سے رہا۔ یہیں سے ان کی کتاب لغات القرآن شایع ہوئی جو ایک مفید قرآنی خدمت ہے، یہ حروف معجم پر مرتب کی گئی ہے اور چھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ شروع کی چار جلدیں جو الف سے شروع ہوکر ع پر ختم ہوئی ہیں مولانا نعمانی کے قلم سے ہیں اور آخری دونوں جلدیں مولانا سید عبدالدائم جلالی نے مرتب کی ہیں، پہلی جلد کے شروع میں مولانا عبدالرشید نعمانی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں کتاب کی نوعیت اور اس کی ترتیب میں ملحوظ رکھے جانے والے امور کے علاوہ اپنی محنت و جاں فشانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ دہلی میں قیام کے زمانے میں ماہنامہ برہان میں ان کے مضامین بھی شایع ہوئے۔

تقسیم کے چند برس بعد وہ کراچی میں متوطن ہوگئے تھے، یہاں انہوں نے امام ابن ماجہ پر جو عالمانہ و محققانہ کام انجام دیا وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، جس سے حدیث کا کوئی طالب علم مستغنی نہیں رہ سکتا، اردو میں ان کی کتاب "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" اور عربی میں "ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب کراچی نے شایع کی۔ یہ دونوں تصانیف نہ صرف امام ابن ماجہ کے حالات و کمالات اور ان کی سنن کی خصوصیات کا مرقع ہیں بلکہ ان میں فن حدیث کی تاریخ و تدوین اور اکابر محدثین کے متعلق گوناگوں معلومات تحریر کئے گئے ہیں۔ اردو میں اشاریے اور نقشے بھی دیے گئے ہیں۔ اس کے



آخر میں مولانا نے یہ بالکل بجا لکھا ہے:

"کہنے کو یہ امام ابن ماجہ کی سوانح عمری ہے لیکن درحقیقت یہ تدوین حدیث کی تفصیلی تاریخ ہے اور مسلمانوں کی ان جانفشانیوں کا مرقع ہے جو انہوں نے خدا کے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ایک ایک حرف کو محفوظ کرنے کے لئے اٹھائی ہیں تاکہ امانت وحی کی ذمہ داری میں جو اس امت کے سپرد کی گئی تھی کسی قسم کا رخنہ نہ آنے پائے اور اللہ کی حجت تمام اہل ملل و ادیان پر تمام ہوجائے"۔

اس کا اطلاق عربی کتاب پر بھی ہوتا ہے، یہ دونوں کتابیں بڑی تلاش و محنت سے لکھی گئی ہیں اور علمی حلقوں میں بہت پسند کی جارہی ہیں، ان سے مولانا کے اچھے علمی ذوق اور تصنیفی سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ راقم کی نظر سے مولانا کی یہی تصنیفات گزری ہیں اور ان سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ لطف و شفقت کا معاملہ فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل مرحمت کرے۔ آمین!

## مولانا قاضی محمد معین اللہ ندوی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نائب ناظم مولانا قاضی معین اللہ ندوی اپنے وطن اندور میں انتقال فرماگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ الخ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی اور سرپرستی میں ان کے معاصرین کے ندوے جانے کے بعد اس کے علمی، تعلیمی اور انتظامی کاموں کو سنبھالنے کے لئے جو جماعت آگے بڑھی ان میں مولانا قاضی معین اللہ ندوی کا نام زیادہ ممتاز ہے، ندوہ کے تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد وہ یہیں استاذ مقرر کئے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے لئے نکلے تو ان کے رفقائے سفر میں مولانا معین اللہ صاحب بھی تھے۔ اس سفر کا انہیں فائدہ ہوا، چنانچہ جب ندوہ کے ذمہ داروں کو قدیم نظام تعلیم میں داخل عربی صرف و نحو اور ادب کی کتابوں کے نقائص

کاشدت سے احساس ہوا تو انہوں نے نحو و صرف کی فارسی کتب کے بجائے اردو میں سہل کتابوں
کی اشاعت کا پروگرام بنایا، اس کے لئے ان کی نظر دارالعلوم کے ان معلمین پر پڑی جو ابتدائی
درجوں میں زبان و صرف و نحو کی تعلیم میں مشغول تھے، اس کے علاوہ مصر میں عربی زبان و ادب
کی ترقی و اشاعت کے لئے اس کے اصول و قواعد کی ازسرنو تدوین اور طرز تعلیم میں اصلاح و
تجدید کی جو کوششیں ہورہی تھیں اس سے بھی یہ لوگ واقف تھے، اس بنا پر ان سے مبتدیوں
کی مشق و تمرین کے لئے نحو و صرف اور ادب و انشا کی کتابیں لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ مولانا
معین اللہ صاحب نے اس سلسلے کی تکمیل میں تمرین الصرف لکھ کر ہاتھ بٹایا جو جدید طرز پر
صرف کی ایک مشقی کتاب ہے۔

مولانا معین اللہ صاحب میں انتظامی صلاحیتیں بدرجۂ اتم تھیں، اس کا اندازہ مولانا
علی میاں کو بہ خوبی تھا، اس لئے مولانا محمد عمران خاں کے ندوے سے جانے کے بعد انہوں نے
مولانا معین اللہ صاحب کو تعمیرات کے شعبے کا ذمہ دار بنایا اور پھر انہیں نائب ناظم کے
عہدہ پر فائز کیا۔

وہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے مولانا علی میاں کے دست راست ہوگئے تھے مولانا
ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور ان کی دل جوئی بھی کرتے تھے، عموماً انتظام اور ذمہ داری کے کام
انجام دینے والے اشخاص سے لوگوں کو شکایتیں رہا کرتی ہیں جو عموماً بے جا اور خود غرضی پر مبنی
ہوتی ہیں، مولانا معین اللہ صاحب کے متعلق جب کبھی اس طرح کی چہ میگوئیاں ہوتیں اور وہ
بددل ہوتے تو مولانا علی میاں ان کے اخلاص اور حسن نیت کی وجہ سے ہمیشہ آڑے آجاتے۔

مولانا معین اللہ صاحب خلقتاً نحیف اور کمزور تھے، عرصے سے ان کی صحت خراب چل
رہی تھی، عمر بھی ۸۰ برس سے متجاوز ہوگئی تھی آخر وقت موعود آگیا۔ ان کے انتقال سے ندوۃ العلماء



اپنے ایک فعال اور مخلص خدمت گزار سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی تلافی فرمائے، انہیں
اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اعزہ و متوسلین کو صبر جمیل عطا کرے آمین!

## جناب شمس پیرزادہ

افسوس ہے کہ جولائی کے اوائل میں جناب شمس پیرزادہ بمبئی میں حرکت قلب بند
ہوجانے سے انتقال کرگئے، وہ کلیان میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے تھے، یہیں ابتدائی تعلیم
حاصل کرنے کے بعد انجمن اسلام بمبئی سے ہائی اسکول پاس کیا، بعض اساتذہ سے عربی بھی سیکھی۔
اس طرح مراٹھی، اردو، عربی اور انگریزی کئی زبانوں سے ان کو اچھی واقفیت تھی۔

جماعت اسلامی مہاراشٹر کے سربراہ کی حیثیت سے راقم ان کے نام سے بہت پہلے سے
واقف تھا، لیکن ان کی علمی لیاقت اور تصنیف و ترجمہ کی صلاحیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب
وہ ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کے بعد بعض اختلافات کی بنا پر جماعت اسلامی سے الگ ہوئے اور
ادارۂ دعوۃ القرآن قائم کیا جہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔

قرآن مجید، احادیث نبوی اور فقہ اسلامی کا مطالعہ انہوں نے دقت نظر سے کیا تھا۔
دعوۃ القرآن کے نام سے کئی جلدوں میں عام فہم اور آسان زبان میں ایک تفسیر لکھی جو بہت
مقبول ہوئی، حدیث میں ان کی کتاب جواہر الحدیث کو بھی قبولیت نصیب ہوئی، فقہ کے
جدید مسائل پر انہوں نے متعدد رسائل لکھ کر اپنی فقہی و دینی بصیرت کا ثبوت دیا، ان کا تعلق
اسلامی فقہ اکیڈمی سے بھی تھا جس کے سمیناروں میں وہ برابر شریک ہوتے اور ان کی رائے کا
لحاظ بھی کیا جاتا تھا۔ پہلی بار میری ملاقات ان سے ہمدرد نگر دہلی کے سمینار میں ہوئی تھی، پھر
بمبئی میں ملے تو اپنا ادارہ دیکھنے کی دعوت دی، وہاں گیا تو بڑی محبت و شفقت سے پیش آئے
اور نہایت شوق سے ادارہ دکھایا۔

انہیں عربی سے اردو ترجمے کا اچھا ملکہ تھا، ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی دو ضخیم عربی کتابوں الحرام والحلال اور فقہ الزکوٰۃ کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا تھا خود ان کی متعدد کتابوں کے بھی ترجمے عربی، انگریزی، ہندی، مراٹھی اور گجراتی میں ہوئے۔

پیرزادہ صاحب کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہ عقیدہ و مسلک میں اس کے ہم نوا نہ تھے بلکہ اصحاب حدیث و سلفیہ کے مسلک پر کاربند تھے مگر اس میں ان کو غلو و تعصب نہ تھا وہ بڑے نحیف اور کمزور تھے، لیکن ایمان و عقیدہ میں پختہ تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!

## میر مقصود علی خاں

یہ خبر بھی بڑے افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ بنگلور سے نکلنے والے روزنامہ سالار کے اڈیٹر و مالک جناب میر مقصود علی خاں کی وفات ہوگئی۔ ایک زمانے میں سیاسی سرگرمیوں سے ان کا بڑا تعلق تھا۔ ریاستی اسمبلی کے دو بار رکن منتخب ہوئے، راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۶۲ء میں نجلنگپا کی کابینہ میں وزیر ہوئے۔ لیکن اب ادب و صحافت کی جانب ان کی توجہ مرکوز ہوگئی تھی۔ وہ کرناٹک پتریکا اکادمی کے رکن تھے۔

دین سے طبعاً لگاؤ تھا۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، مولانا علی میاں سے عقیدت تھی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن تھے، اس کے جلسوں میں ان سے برابر ملاقات رہتی، بڑی محبت اور خوش خلقی سے ملتے۔ دارالمصنفین اور معارف کے بڑے قدرداں تھے۔ یہ ان کے مطالعہ میں بھی رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!!!

"ض"



باب التقریظ والانتقاد

# "متاعِ فکر و نظر"

از ڈاکٹر محمد ثمنیٰ رضوی۔ ٭

"متاعِ فکر و نظر" جناب علی جواد زیدی کے تنقیدی، علمی اور تحقیقی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے زیدی صاحب ایک پہلودار شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ خوش فکر شاعر، اچھے ناقد، ذمہ دار محقق اور مشہور دانشور ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ادبی، تہذیبی، قومی، لسانی اور تحقیقی مسائل سے متعلق گہرے اور معنی خیز مباحث دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے پہلا مضمون دراصل اردو کے نامور ناقد پروفیسر ممتاز حسین کی معرکۃ الآرا تصنیف "حالی کے شعری نظریات ۔ ایک تنقیدی مطالعہ" پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے۔ حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کے متعلق پروفیسر کلیم الدین احمد نے محض منفی اعتراضات کئے ہیں جن کو تنقیدی جائزے یا تحلیل و تجزیہ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی بیش بہا تصنیف "ہماری شاعری" بھی کوئی مدلل اور مشرح جائزہ پیش کرنے کے بجائے محض ایسے نکات کی جانب توجہ مبذول کرتی ہے جن کو حالی نے نظر انداز کر دیا تھا۔ ممتاز حسین نے وزن، کلام موزوں، تخیل، اصلیت اور واقعیت کے سلسلے میں حالی کے خیالات کا جس طرح تجزیہ کیا ہے اور ان کی خامیوں اور نارسائیوں کا پردہ فاش کیا ہے اس کی داد علی جواد زیدی صاحب نے بڑے منطقی انداز میں دی ہے۔ ممتاز حسین نے کئی جگہ حالی کی تحقیقی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جیسے ابن رشیق کی نسبت سے حالی نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا ماخذ ابن خلدون کا مقدمہ ہے۔

٭ وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ۔ گیا۔

ممتاز حسین نے حالی کے تمام مآخذ کا پتہ لگا کر اور ضروری تصحیحات کرکے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔ علی جواد زیدی نے اس کتاب کی تنقیدی اور تحقیقی اہمیت کے پیش نظر یہ صائب رائے دی ہے کہ "مقدمہ شعر و شاعری" کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ممتاز حسین کی اس تنقیدی تصنیف کو بھی پیش نظر رکھنا مفید اور ضروری ہے۔ اس کی جامعیت کی وجہ سے بعض ناقدوں نے اسے جدید بوطیقا بھی کہا ہے۔

ہمارے یہاں محمد شاہ کے دور کے شاعروں کو ایہام گو کہہ کر نظر انداز کر دینے کی روش عام ہے۔ زیدی صاحب نے اس عہد کا مکمل پس منظر بیان کرکے اور اشعار سے مثالیں پیش کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس دور کی ساری شاعری نہ تو سراسر ایہام تھی اور نہ ایہام کی صنعت دور محمد شاہ کی ایجاد ہے۔ کالی داس کے ادبی شاہکار "میگھ دوت" کا شمار عالمی ادب کے بہترین سرمایوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بے شمار ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ مشرقی اتر پردیش کے ضلع غازیپور کے ایک معمولی سے قصبہ بحری آباد کے رہنے والے مولوی قمر احمد قمرؔ نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ جس کے شروع میں ان کا تفصیلی مقدمہ بھی شامل ہے۔ علی جواد زیدی نے مولوی قمر احمد قمرؔ کے اس منظوم ترجمے کا تعارف اردو کے ادبی حلقوں میں کرا کے ایک گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

اس مجموعے کا ایک اہم مضمون "اردو تحقیق کے چند سنگ میل اور ستون ہے"۔ تحقیق کے لئے مناسب بنیادی مواد کی فراہمی اور محقق کی افتادِ طبع دونوں کا صحیح امتزاج ضروری ہے۔ اگر مواد تو ہو لیکن محقق سہل انگار ہو تب بھی کام نہیں چلتا اور اگر محقق میں ایوبی صبر اور فرہادی جذبہ کوہکنی تو ہو لیکن مواد اس کی دسترس سے باہر ہو تب بھی بات نہیں بنے گی۔ زیدی صاحب نے کافی چھان بین کے بعد تحقیق کے اس دور کا ذکر کیا ہے اور اس کی خامیوں اور



کمزوریوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس سلسلے میں تذکروں کا ذکر کرتے ہوئے "آب حیات" کو ایک سنگ میل بتایا ہے جس میں پہلی بار مواد کے انتخاب میں دیدہ وری سے کام لے کر اسے تاریخی اور تنقیدی تسلسل کے ساتھ یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی قدر مواد ذاتی ذرائع سے بھی فراہم کیا ہے اور کسی حد تک دور بندی کی بھی کوشش کی جو ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہے۔ اس میں خامیاں اور کچھ جنبہ داریاں بھی ہیں۔ آزاد سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرنے کے علاوہ کبھی کبھی افسانہ طرازی کر بیٹھے ہیں۔ تاہم "آب حیات" ان کا بڑا کارنامہ ہے جس میں تذکرے پر تنقید کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی بنیاد پر مولوی عبد الحئی نے "گل رعنا" اور مولوی عبد السلام ندوی نے "شعر الہند" لکھی۔ دونوں کے یہاں آزاد کا تتبع خاص طور پر نمایاں ہے۔ زیدی صاحب نے ادبی اسکولوں کی تقسیم کو بناوٹی اور غیر حکیمانہ قرار دیتے ہوئے اس پر از سر نو نگاہ ڈالنے کی ضرورت واضح کی ہے۔ ان کو تذکروں اور تاریخوں میں نثر نگاروں کا تذکرہ نہ ہونے کی شکایت بھی ہے۔ اس کمی کی تلافی سید عبد الحئیؔ تنہا اور احسن مارہروی نے کی۔ زیدی صاحب نے اردو کے اکثر محققین کے کارناموں کا مختصر جائزہ اس مقالہ میں لیا ہے۔ اس سے ان کے مطالعے کی غیر معمولی وسعت اور دیدہ وری کا پتہ چلتا ہے۔

"لوک گیت کی زندہ روایت" کے عنوان سے ایک اہم مضمون اس کتاب کی زینت ہے۔ اس سلسلے میں ان کے چند جملے ملاحظہ ہوں: "لوک گیت ہمارا بنیادی یعنی عوامی تہذیبی ورثہ ہیں۔ یہ اجتماعی ذہن کی پیداوار ہیں لیکن ان کی تخلیق اجتماعی اور انفرادی دونوں ہی سطحوں پر ہوئی ہے۔ ان گیتوں کے سوتے دلوں سے پھوٹے ہیں یہ جذبۂ بے اختیارِ شوق کی کرشمہ آفرینی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ گیت زبانوں سے زبانوں تک اور سینوں سے سینوں تک منتقل ہوتے رہے اور زندہ رہ گئے۔" اس مضمون میں زیدی صاحب نے اردو کے تہذیبی محرکات پر

بڑی خیال انگیز اور جدید ترین معلومات سے پُر باتیں کہی ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے، ان کے خیال میں لوک گیت کے جو نمونے دیوناگری اور دوسرے رسم الخط میں ملتے ہیں ان سے ہم اسی طرح رشتہ جوڑیں جس طرح ہندی والے اردو رسم الخط اور گجراتی رسم الخط سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان کو نئے معلومات کی روشنی میں جانچنا پرکھنا ہوگا اور ان پر اپنی پہچان اور شناخت کے نقش کو گہرا کرنا ہوگا۔

مرثیہ اور سلام علی جواد زیدی کی ادبی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اس مجموعے میں بھی عہد حاضر کے ایک قابل ذکر مرثیہ نگار امید فاضل کے مراثی کا تجزیہ ہے، مختصر ہونے کے باوجود اس سے امید فاضل کی منفرد شاعرانہ خصوصیات کا اندازہ بڑی حد تک ہوجاتا ہے۔ معیاری زبان کے مسئلے پر ان کی باتیں حقایق پر مبنی ہیں، اس سلسلے میں وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ ہم زبان کا معیار قائم رکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ معیار موجودہ حالات پر منطبق ہوسکے۔ دل و دماغ وا ہونے کے ساتھ احتیاط بھی ضروری ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کے لئے اردو کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے۔ لیکن الفاظ اور محاوروں کے اخذ میں یہ محتاط بھی رہی ہے۔ محاورے اور روزمرے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو باقاعدگی سے اکٹھا کرکے جانچ پرکھ کے بعد شامل لغت کرنا ہوگا۔ معیار کی اہمیت سے اردو زبان نہ کبھی منکر رہی ہے اور نہ اب منکر ہوسکتی ہے۔

اس مجموعے کے کئی اور مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان سب پر الگ الگ اظہار خیال ممکن نہیں۔ یہ مجموعہ اردو زبان کے تنقیدی سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ فاضل مرتب و ناشر جناب سبط محمد نقوی کے عالمانہ پیش لفظ نے اس میں چار چاند لگا دیا ہے۔



## مطبوعاتِ جدیدہ

**مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت** از جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۳۲، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: مکتبہ شاہد علی گڑھ کالونی، کراچی۔ ۴۱ پاکستان۔

الہلال والبلاغ وغیرہ کی بے مثال شہرت اور مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق تحریروں کی کمی نہیں، لیکن اس موضوع کے جائزے کے لئے جس مطالعہ و محنت و لیاقت کی ضرورت ہے، فاضل مصنف کے خیال میں اس لحاظ سے کوئی جامع جائزہ نظر نہیں آتا، زیر نظر کتاب کو بھی 'ابتدائی کام' بتایا گیا ہے، تاہم اس میں مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کا مکمل احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، الہلال والبلاغ، پیغام و لسان الصدق کے علاوہ المصباح، نیرنگ عالم، اقدام، تحفہ احمدیہ، ایڈورڈ گزٹ اور دار السلطنت جیسے رسالوں سے مولانا آزاد کے تعلق و نسبت کا بیان خاص طور سے معلومات افزا ہے، بعض رسائل کے مضامین کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے، توقع ہے کہ آئندہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی، البتہ فاضل مرتب کا یہ خیال وضاحت طلب ہے کہ مولانا آزاد اور الہلال کو صحافت کے عام اصول اور فن کی کسوٹی پر پرکھنا ظلم اور بعید از انصاف ہوگا۔

**المیزان** از جناب مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۲۴۴، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: ادارہ احیائے دین بلریا گنج، اعظم گڈھ، یوپی۔

چند سال قبل مولانا سبحانی کی کتاب حقیقت رجم شایع ہوئی تھی، جس کے بعض مشمولات و

نظریات کے رد میں متعدد کتابیں شایع ہوئیں جن کا ذکر ان صفحات میں بھی آچکا ہے، یہ کتاب گویا جواب الجواب ہے، مصنف نے اپنے خیال میں اسے دلکش و موثر بنانے کی غرض سے مباحث کو 'ایمان افروز علمی مجالس' کی شکل میں پیش کیا ہے، یہ کل چوبیس مجلسیں ہیں اور ہر مجلس میں رجم کے متعلق ان ہی خیالات کی تکرار و وضاحت ہے جو 'حقیقت رجم' میں بیان کئے جاچکے ہیں، ان مجالس کے مستقل شرکا میں حکیم فردوسی، خواجہ شیرازی، مولانا عرفی، شیخ مکی، حکیم بجلی و دھومی، حضرت مدنی اور ڈاکٹر گلزار وغیرہ ہیں، اس مجلسی حظ و لطف نے عوامی مشاعروں کا رنگ پیدا کردیا ہے جو خالص علمی اور سنجیدہ تحریروں کے لئے مناسب نہیں، حقیقت رجم و رجم حقیقت کے اس مناظرہ علمی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے المیزان بھی فیصلہ کرنے میں ممد و معاون ہوسکتی ہے۔

**حکیم کلب علی شاہد** از جناب خورشید مصطفی رضوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت وطباعت، مجلد صفحات ۱۸۴، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: اہلو والیہ بک ڈپو ۸۱/۹۴، ۹۹ نیو روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

امروہہ کی مردم خیز بستی علماء، فضلاء اور شرفاء سے ہمیشہ معمور رہی، موجودہ دور میں جناب حکیم کلب علی شاہد اس کی پاکیزہ روایتوں اور مخصوص تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے، افسوس کہ چند ماہ پہلے بزم دوشیں کی یہ روشن شمع گل ہوگئی، وہ حاذق طبیب، باکمال نباض، صاحب ذوق ادیب و اہل قلم، سخن سنج و سخن فہم تھے، ادب کے علاوہ فن طب پر انہوں نے متعدد عمدہ مقالے سپرد قلم کئے جیسے علاج باللون، آگ اور خاک اور ضغط الدم وغیرہ، ان کا کلام بھی بڑا پاکیزہ ہے لیکن اس سے بڑھ کر وہ عظیم کردار کے حامل ایسے انسان تھے جو اب نایاب ہوتے جاتے ہیں، امروہہ اور اس کے نواح میں ان کے کمال فن اور مجلسی



زندگی کا بڑا چرچا رہتا تھا، زیر نظر مجموعہ مضامین میں ان کے احباب و رفقا نے اس باکمال شخصیت کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور لائق مرتب کے مضامین پڑھنے کے لائق ہیں۔

**انجمن کے چند روشن چراغ** از جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۲، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

بمبئی کی انجمن اسلام کی تعلیمی اور سماجی خدمت کا دائرہ بڑا وسیع و ہمہ گیر ہے، اس کے استحکام اور کامیابی میں اس کے بانیوں اور ذمہ داروں کی محنت و ریاضت اور خلوص و استقامت کو خاص دخل ہے، انجمن سے اس کتاب کے فاضل مصنف کا تعلق بھی عرصے سے ہے، اس طرح اس کے مختلف ذمہ داروں سے ان کا واسطہ رہا ہے، اب انہوں نے اپنے نقوش و تاثرات کو اس لئے قلم بند کیا ہے تاکہ انجمن سے وابستہ اشخاص کی عملی تصویر محفوظ ہوجائے اور قومی کام کرنے والے ان کے روشن پہلوؤں سے فائدہ اٹھا سکیں، ذاتی تجربوں اور مشاہدوں پر مبنی یہ دلچسپ تاثرات انجمن کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے میں بڑے معاون ہوسکتے ہیں۔ مصنف ذمہ دار اور پختہ مشق اہل قلم ہیں، مگر جو لوگ اب اس دنیا میں نہیں رہے ان کے متعلق ایسی باتیں لکھنا جو محض سنی سنائی یا تسلیم شدہ نہ ہوں، احتیاط کے منافی ہیں۔ سید شہاب الدین دسنوی اور اکبر پیر بھائی کے ذکر میں بھی بے احتیاطی کی گئی ہے، خلیفہ ضیاء الدین کے ذکر میں ایک واقعہ کے بیان میں انداز رکیک ہوگیا ہے، بعض خیالات مثلاً "مہاراشٹر کے وزرائے اعلیٰ نے کبھی ہندو مسلمان میں امتیاز نہیں برتا، کانگریس کے آخری چیف منسٹر شرد پوار کا بھی یہی حال تھا" کی تصدیق حقایق کی زبان سے نہیں ہوتی۔

**قواعد اردو** از جناب خان بہادر پروفیسر فدا علی خاں مرحوم، ترتیب و تکمیل، مولانا محمد عبد السلام خاں رامپوری مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۲۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

۱۹۹۵ء میں چھپی یہ کتاب خدا بخش لائبریری کی چند اور مطبوعات کے ساتھ تبصرے کے لئے موصول ہوئی تھی، صفحات کی تنگی کی وجہ سے تبصرہ میں تاخیر ہوگئی، قیمتی اور کم یاب کتابوں اور مسودوں کو جدید حواشی سے مزین کرکے اہتمام سے شایع کرنا خدا بخش لائبریری کا طرۂ امتیاز ہے، اردو زبان کے قواعد اور اصول صرف و نحو پر اگرچہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی کتابیں اور رسالے شایع ہوتے رہے لیکن بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق کی قواعد اردو سے پہلے ان تمام کتابوں میں عربی اور فارسی زبان کے قواعد کا تتبع کیا گیا، اردو کی آریائی پراکرت ساخت کی جانب توجہ نہیں کی گئی، اس نقص کی تلافی بابائے اردو نے کی اسی سلسلہ میں زیر نظر کتاب بھی آتی ہے، جس کے مرتب ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو و فارسی اور زبان کے مزاج داں فاضل مولوی فدا حسین رام پوری (م ۱۹۳۸ء) تھے۔ ان کا یہ ناتمام مسودہ نامور عالم و فلسفی مولانا عبد السلام خاں رام پوری کی نظر سے گزرا تو انہوں نے ذیلی حاشیوں اور نوک پلک سے درست کرکے اسے مکمل کردیا، اور ایک بلند پایہ مقدمہ بھی سپرد قلم کیا، حصہ نحو کے نہ ہونے اور صرف املا و صرف تک محدود رہنے کے باوجود اردو قواعد کی تحصیل اور لغت و لسانیات کی نزاکتوں سے واقفیت کے لئے یہ مبتدی و منتہی دونوں کے لئے مفید اور کارآمد کتاب ہے۔

ع۔ ص۔